۱۸۵۷ کے مجاہد

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں جن بہادر اور
اولوالعزم مجاہدوں نے اپنی جان کی بازی
لگائی، اُن کے مفصل اور مستند سوانح حیات

غلام رسول مہر

کتاب منزل، لاہور

۱۸۵۷ء کے مُجاہد

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں جن بہادر اور
اولوالعزم مُجاہدوں نے اپنی جان کی بازی
لگائی، اُن کے مفصّل اور مُستند سوانح حیات

غلام رسول مہر

کتاب منزل، لاہور

89

۱۸۵۷ کے مجاہد

غلام رسول مہر

کتاب منزل لاہور

مصنف ــــــــــــــ غلام رسول مہر

طابع ــــــــــــــ شیخ نیاز احمد

مطبع ــــــــــــــ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ــــــــــــــ کتاب منزل لاہور

۱۸۵۷ کے مجاہد

جن بہادر، جانباز اور اولوالعزم مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی، ان کے مستند اور مفصل سوانح حیات۔

غلام رسول مہرؔ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

"۱۸۵۷ء" کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا، جسے اب پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً بعض ممتاز مجاہدینِ آزادی کے حالات سامنے تھے، لیکن یہی تصور کیے بیٹھا تھا کہ عام واقعات کے سلسلے میں وہ حالات بھی آجائیں گے یا ضرورت محسوس ہوگی تو مناسب مقامات پر چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر تکلف ہوگا، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جنسوں میں امتزاج پیدا کیا جائے۔

بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھی کہ جن عزیمت دوست اور حمیت پرور شخصیتوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں مقصدِ آزادی کے لیے وقف کیں، ان کی ایک بہت بڑی یادگار یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے سوانح مرتب ہو جائیں تاکہ عام لوگ ان سے عزیمت و حمیت کے سبق لیں۔ اس لیے بھی ضروری تھی کہ سیر و سوانح کے ذریعے سے قوموں کے لیے بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعے سے غالباً فراہم نہیں ہو سکتا۔

ناانصافی ہوگی، اگر میں اعتراف نہ کروں کہ مجھ سے پیشتر بھی بعض اصحاب نے اس کام کے سرانجام کی کوشش کی، لیکن اوّل معلومات کا سرمایہ بہت معمولی تھا، دوم اندازِ ترتیب شخصیتوں کی عظمت کے شایانِ شان نہ تھا، سوم شخصیتوں کے انتخاب میں ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی پر حصر نہ کیا گیا بلکہ بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر لیا گیا

جو یقیناً حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا پاکر انڈیمان پہنچیں۔ تاہم یہ ابتلاء ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں پیش نہ آئی تھیں بلکہ وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔

مثلاً:

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری یقیناً انڈیمان بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزار دیے۔ تاہم یہ سزا سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں ہوئی تھی نہ کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں۔

۲۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی خولہ بالا "جرم" میں سزایاب ہوئے تھے۔

۳۔ منیر شکوہ آبادی کو بھی یقیناً انڈیمان بھیجا گیا تھا لیکن انھیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کہ مصطفیٰ بیگ نام ایک شخص نے نواب جان طوائف کو قتل کر کے تزویر سے منیر کو الجھا دیا تھا۔ منیر خود کہتے ہیں:

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے
کج روی میں بڑھ کے چرخ پیر سے
کر کے خون ناحق نواب جان
مجھ کو پھنسوا دیا تزویر سے

۴۔ اسی طرح مولانا امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ یقیناً ہدف ستم بنے، لیکن انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

غرض میرا مقصد یہ تھا کہ صرف انھیں اصحاب عزیمت کے حالات لکھے جائیں، جن کی سرگرمیاں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے وقف رہیں۔

صحیح اور مستند حالات کی فراہمی جتنی مشکل اور پریشان کن تھی، اس کے بارے میں کیا عرض کروں؟ شاید ارباب علم وفضل کتاب کے ملاحظے سے ایک حد تک اندازہ فرما سکیں کہ مجھے کیا کیا زحمتیں اٹھانی پڑیں اور یہ کام کس درجہ دشوار و مشقت طلب تھا۔ یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ میں نے لکھ دیا ہے اُسے حرف آخر سمجھنا چاہیے۔ اپنی کم سوادی کا تہ دل سے اعتراف کرتا ہوا صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ ان اوراق میں آگیا ہے، اس سے بیشتر غالباً کسی بھی زبان میں یکجا نہیں ہو سکا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نہ تمام مجاہدوں کے پورے حالات فراہم کر سکا، نہ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ تھا

اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے سوا جن لوگوں نے مختلف حصّوں میں کام کیا اور ان کا ذکر نہیں آیا، وہ صفِ مجاہدین میں شامل ہونے کے حقدار نہ تھے۔ جو سرمایہ معلومات تاحال فراہم ہو سکا اُسے اپنے تصوّر کے مطابق لباسِ ترتیب پہنا دیا۔ آیندہ جو کچھ معلوم ہوگا، اس کی روشنی میں اضافہ و ترمیم کا عمل جاری رہے گا۔

بعض اہم شخصیتیں اس تذکرے میں دانستہ شامل نہ کی گئیں مثلاً بہادر شاہ ظفر یا زینت محل یا بعض دوسرے اکابر۔ وہ اس لیے کہ ان کے زیادہ تر حالات دہلی کے ضمن میں بیان ہو چکے تھے اور تکرار مناسب نہ تھی۔ بعض شخصیتوں کے نام یا کام سرسری طور پر ضمناً درج ہو گئے اور ان کے لیے الگ عنوانوں کے ماتحت مستقلاً کچھ نہ لکھا گیا، اس لیے کہ زیادہ معلومات دستیاب ہی نہ ہو سکیں۔

۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی سیرتوں کا مرقع اس انداز میں پہلی مرتبہ پیش ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں فروگزاشتیں محسوس ہوں یا بعض پہلو تشنۂ تکمیل نظر آئیں تاہم امید ہے کہ خوانندگانِ کرام اس کتاب کو مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کا بالکل نیا مرقع پائیں گے۔

یہ اُن بلند ہمّت اور اولوالعزم شخصیتوں کے سوانح ہیں، جنھوں نے اس دَور میں آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی، جب اصل مقصد کے لیے تحسین و ستائش کا اندازہ بھی عوام کے ذہنوں میں صورت پذیر نہ ہُوا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی غرض یہ نہ تھی کہ دُنیا کی زبانوں پر اُن کے کارناموں کی مدح کے ترانے جاری ہیں؟ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو جائے اور اجنبی حکومت کا نقشِ باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ انھوں نے شدید تاریکی میں زندگی کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اپنا خونِ حیات اس بے پروائی سے بہایا کہ دوسروں کو شاید اس طرح پانی کے چند چُلّو بہانے میں بھی تکلّف ہو۔

ان کے کارناموں پر ایک سَو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی غالباً اکثر اصحاب کو معلوم نہ ہوں۔ انگریزوں نے بحالی اقتدار و تسلّط کے بعد ان مساکین کی بے مثال قربانیوں کے موازنے کا موقع بھی نہ آنے دیا، لیکن خلوص و بےنفسی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی قدرت ضائع نہیں ہونے دیتی۔ انھوں نے تو بہت بڑے عمل کے لیے قدم اٹھایا تھا اور جو خواب دیکھا تھا، اُس کی تعبیر آج سب کے سامنے ہے۔ حق و انصاف کی میزان کا فیصلہ یہی ہے کہ انھوں نے جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا تھا اور اسے اپنی زندگی کے لہو سے سینچا تھا، وہ نوّے سال کے بعد پھل لایا۔ انگریزی حکومت اپنی بے پناہ قاہری کے باوجود مٹ گئی۔ آج ہر احسان شناس قلب میں ان مجاہدین کی یاد تازہ ہونی چاہیے، جو ایک سَو سال پیشتر انتہائی مشکلات میں اپنا

فرض احسن طریق پر بجا لاتے ہوئے خوفناک صبر آزمائیوں کی منزل سے کامیاب و کامگار گزر گئے۔

میں ادائے فرض کے سلسلے میں فرقہ وار تفریقات کا قائل بھی نہیں اور انھیں پسندیدہ بھی نہیں سمجھتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر اور حد درجہ ممتاز حصّہ مسلمانوں نے لیا۔ بلاشبہ وہ تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جوش آزادی کی بے کرانی اور قربانیوں کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے لوگ باوجود کثرت تعداد ان سے منزلوں پیچھے رہ گئے۔ یہ اس دور میں مُسلمانوں کی شانِ امتیاز تھی، جب اس ملک پر بے حسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں جس قوم کا حصّہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور جس نے عارضی ناکامی کے بعد نقصان بھی سب سے زیادہ اٹھائے، کیا یہ امید بے جا سمجھی جائے گی کہ اس جہاد کی یادگار منانے کی سب سے بڑھ کر حقدار وہی قوم ہے؟

مہر

مسلم ٹاؤن - لاہور

۱۷- مارچ ۱۹۵۷ء

حضرت محل

واجد علی شاہ کے حرم میں

نواب حضرت محل کے ابتدائی حالات کی نسبت اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ان کا نام "امراؤ" تھا[1]۔ ۱۳۔رجب سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۵ر دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء) کو حضرت علی رضؓ کے میلاد کی مجلس میں، واجد علی شاہ نے، کہ ابھی ولی عہد تھے، امراؤ کو دیکھا اور داخل محل کر لیا[2]۔ خود واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ امراؤ:

> امن و امان کے ذریعے سے .... پسند خاطر ہو کر میرے گھر پڑ گئی۔
>
> حسب معمول "مہک پری" خطاب دے کر تعلیم رقص و سرود میں مشغول کر دی گئی ہے۔

واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ایک "پری خانہ" قائم کیا تھا جس میں خوبصورت عورتیں داخل کی جاتی تھیں اور وہ رقص و سرود کی تعلیم پاتی تھیں۔ امراؤ بھی پہلے اسی پری خانے میں پہنچی۔

برجیس قدر کی پیدائش

شعبان سنہ ۱۲۶۲ھ میں امراؤ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، واجد علی شاہ کا بیان ہے:

> مہک پری کے حاملہ ہونے کا مژدہ میں نے سنا، ہزار ہزار سجدۂ شکر درگاہ قاضی الحاجات میں ادا کیے اور مہک پری کو پردے میں بٹھا کر افتخار النسا خانم صاحبہ خطاب عنایت فرمایا۔

---

[1] تاریخ اودھ حصۂ پنجم صہ ۶۹ ، [2] ایضاً صہ ۷۰

بعد انقضائے ایام مقررہ فرزندِ ارجمند لختِ جگر اس کے بطن سے پیدا ہوا (لڑکے کے
دادا امجد علی شاہ) نے بہ صد ہزار خوشی و خرمی گیارہ ضرب توپ سلامی اور مبارکباد
کی چھڑوائیں اور لڑکے کو مرزا برجیس قدر بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔[1]

اس سے واضح ہے کہ "مہک پری" امراؤ ہی کا پہلا لقب تھا۔ اسی کو افتخار النسا کا خطاب ملا اور وہی برجیس قدر کی والدہ تھیں۔ مولوی نجم الغنی رام پوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہک پری افتخار النسا کوئی اور خاتون تھی جس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اور دو چار دن ہی زندہ رہ کر مر گیا۔[2]

برجیس قدر کی تاریخ پیدائش کہیں نظر سے نہیں گزری۔ چونکہ شعبان ۱۲۷۳ھ میں اس کی گیارھویں سالگرہ منائی گئی لہٰذا میں نے اس کی تاریخ پیدائش شعبان ۱۲۶۲ھ (جولائی و اگست ۱۸۴۶ء) قرار دی۔ امجد علی شاہ اس وقت زندہ تھے اور وہ صفر ۱۲۶۳ھ (فروری ۱۸۴۷ء) میں فوت ہوئے اور برجیس قدر خطاب انھیں کا تجویز کردہ تھا۔ لہٰذا میری قرار دادہ تاریخ عین قرینِ صواب ہے۔ برجیس قدر کا اصل نام رمضان علی تھا۔ واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو بعض دوسرے محلات کے علاوہ افتخار النسا خانم امراؤ، والدہ برجیس قدر کو بھی "محل" کا درجہ عطا کیا اور حضرت محل کا خطاب تجویز ہوا۔[3]

قدرت کے عجائبات

ظاہر ہے کہ حضرت محل کے ان حالات میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جس سے ان کی آیندہ عظمت و عزت کی کوئی کرن، یا کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔ وہ بالکل معمولی ماحول میں پیدا ہوئی۔ وقت کے عام اوضاع و اطوار کی رَو میں بہتی ہوئی شاہی محل کے اندر پہنچی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حُسن ظاہری سے اُسے حصّہ وافر ملا ہو گا۔ شاہی محل میں داخلے کے لیے اس کے پاس یہی ایک دستاویز تھی۔ پھر اُس زمانے کے لکھنؤ خصوصاً شاہی محل کے احوال و ظروف میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو حضرت محل کے خداداد عملی اور اخلاقی محاسن کے لیے مہمیز بن سکتی۔ اِن احوال و ظروف میں عشرت آرائیوں اور کامجوئیوں کے سوا کیا رکھا تھا؟ "ناسزا" کاموں کے کرنے کا بھی ایک "سزاوارانہ" طریقہ ہوتا ہے۔ وہاں کی تو عشرت آرائیاں بھی ہر لحاظ سے "ناسزا" انداز میں کی جاتی تھیں۔ نہ احوال روزگار سے آگاہی، نہ حکمرانی کی ذمّہ داریوں کا احساس، نہ یہ خیال کہ خدا نے جو بلند ترین منصب عطا کیا ہے، اس کے فرائض و واجبات ٹھیک ٹھیک ادا نہ کیے گئے تو مآل و انجام کیا ہو گا۔ حضرت محل کے قلب و جگر کی حرارت بڑی ہی بے پناہ ہو گی، جو اس برفستان میں پہنچ کر بھی مائل بہ افسردگی نہ ہوئی اور بارہ سال تک برابر ملتہب و

---

[1] محل خانہ شاہی ص ۶۷، [2] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۱۱۵، [3] محل خانہ شاہی ص ۱۲۷-۱۲۸

شعلہ زن رہی۔ جب سازگار وقت آیا تو حضرت محل نے عورت ذات اور پردہ دار ہونے کے باوجود اس گرمجوشی اور بلند ہمتی سے میدانِ عمل میں قدم رکھا کہ جوانمردوں کو بھی اس پر رشک آنا چاہیئے۔ پھر بڑی بڑی ترغیبات کے باوجود وہ رجعت پر آمادہ نہ ہوئی اور محکومی کی فارغ البال زندگی کے بجائے غربت و بے وطنی کی تنگ حالی خوشی خوشی قبول کر لی۔ یہ قدرت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھا، جو لکھنؤ کے شاہی محل کی اس خاتون کے پردے میں حیرت افزائے عالم ہوًا۔

جنگ آزادی

حضرت محل نے قصرِ شاہی میں زندگی کے دس بارہ سال چُپ چاپ گزار دیے۔ واجد علی شاہ نے تخت نشینی کے بعد خاص محل کے لیے پانچ ہزار، بعض محلات کے لیے تین تین ہزار اور باقی کے لیے دو دو ہزار روپے مقرر کر دیے تھے[1]۔ حضرت محل آخری گروہ میں شامل تھی، گویا اُسے دو ہزار ماہوار ملتے تھے۔ ۲۹- جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۷۲ھ (۷؍ فروری سنہ ۱۸۵۶ء) کو واجد علی شاہ معزول ہوئے اور کلکتہ کا سفر اختیار کیا، حضرت محل ؍ ان بیگمات میں شامل نہ تھی جنھیں شاہ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ بدستور قیصر باغ میں رہی۔ محلات کے لیے جو وظیفے مقرر ہوتے تھے، ان میں سے حضرت محل کا حصّہ اُسے مل جاتا تھا۔ علی محمد خاں، عرف ممو خاں اس کا داروغہ اور منتظم امور تھا۔

۱۰ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں جنگِ آزادی کا پہلا شعلہ نمودار ہُوا۔ پھر پے در پے جگہ جگہ آگ بھڑک اُٹھی اور لکھنؤ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کی ابتدا فوج سے ہوئی تھی، پھر عوام شامل ہُوئے۔ حضرت محل بیچاری محل نشین اور پردہ دار، اس کے لیے بہ طورِ خود کیوں کر ممکن تھا کہ باہر نکل کر سپاہ کی تنظیم کرتی یا کسی جیش کی قیادت سنبھال لیتی؟

نظامت امور کا مسئلہ

چند روز تک فوج کے مختلف دستے اور ان کے ساتھی عوام یا مختلف رؤسا و امراء ہنگامہ آرائی میں مشغول رہے۔ پھر خیال آیا کہ نظمِ امور کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ بعد غور و مشورہ قرار پایا کہ نواب سعادت علی خاں کی اولاد میں سے کسی کو مسندِ حکومت پر بٹھایا جائے، لیکن کوئی موزوں شخص نہ ملا۔ ایک رکن الدولہ نواب محمد حسن خاں تھے جو سب کچھ چھوڑ کر بیلی گارد میں محصور انگریزوں کے پاس جا بیٹھے تھے پھر امجد علی شاہ کے فرزند میرزا رضا علی بہادر دار اسطوت کا نام تجویز ہُوا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ انگریزوں سے تو نواب شجاع الدولہ بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے، ہم اپنی عافیت کیوں تنگ کریں؟ آخر سوچا گیا کہ واجد علی شاہ کے فرزند اکبر میرزا محمد علی حیدر بہادر، نوشیرواں قدر کو بادشاہ بنا لیا جائے۔ لیکن وہ معذور و مصروع تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی جگہ واجد علی شاہ میرزا محمد حامد علی بہادر کیواں قدر کی ولی عہدی کا اعلان کیوں کرتے؟

---

[1] محل خانۂ شاہی ص۱۲۸

برجیس قدر کا

جب ہر طرف سے ناکامی کا سامنا ہوا تو محمود خاں اور شیخ احمد حسین نے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ سے کہا کہ میرزا رمضان علی بہادر برجیس قدر کو کیوں نہ مسند نشین کر لیا جائے؟ راجا نے جواب دیا کہ فوج تو برجیس قدر کو بھی منظور کر لے گی، لیکن یہ ضروری ہے کہ شاہی محل کی تمام بیگمات اِس پر رضامندی کی مُہر ثبت کر دیں۔ چنانچہ بیگمات کو جمع کیا گیا۔ گفتگو چلی تو کوئی بیگم واضح بات نہ کرتی تھی۔ حضرت محل نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ دیا کہ یہ تمہارا لڑکا ہے۔ جیسا تم سب مناسب جانو، کرو۔ نواب خورد محل نے کہا کہ ہمیں تو راضی نامے پر مُہر کر دینے میں تامل نہیں۔ لیکن اگر کلکتہ میں انگریز واجد علی شاہ کو اس بنا پر موت کی سزا دے دیں تو کیا ہوگا؟ ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ برجیس قدر رئیس نہ ہو۔ جیسا مناسب جانو خود کرو، دوسری بیگمات کو اس میں نہ الجھاؤ۔

غرض یہ مشورہ بیچ میں رہ گیا۔ ادھر محمو خاں نے تجویز سوچ لی کہ ہم فوج کے افسروں کو جمع کرتے ہیں۔ اگر وہ بطور خود اتفاق کر لیں تو بیگمات سے راضی نامہ حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔

شرائط اور مسند نشینی

۱۲۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (۵ رجولائی ۱۸۵۷ء) کو اتوار کا دن تھا۔ سارا دِن شدت کی بارش ہوتی رہی۔ شام کے چھ بجے افسران فوج راجا جے لال سنگھ کے ہمراہ قصر خاقانی میں آئے اور میرزا برجیس قدر کو دیکھا۔ اس وقت میرزا کی عمر دس سال کچھ مہینے کی تھی۔ بعض افسران فوج نے کہا کہ بچہ بہت چھوٹا ہے، فوجوں کی قیادت کیا کرے گا؟ بعض نے کہا کہ بہت خوبصورت ہے، رزم و پیکار کی سختیاں برداشت نہ کر سکے گا۔ آخر انھوں نے چند شرطوں کے ساتھ برجیس قدر کی مسند نشینی منظور کر لی۔ شرطیں یہ تھیں:

۱۔ شاہ دہلی کے پاس عرضداشت بھیجی جائے۔ وہ منظور کر لیں تو یہ رئیس رہیں گے، خواہ ان کے لیے بادشاہی تجویز کریں یا وزارت[1]۔

۲۔ فوجیوں کو تنخواہ دُگنی ملے گی۔ یعنی چھ روپے کی جگہ بارہ روپے۔

۳۔ ہر پلٹن کے افسر فوجی تجویز کریں گے۔

۴۔ نائب و دیوان کے تقرر و برطرفی کا معاملہ بھی فوجیوں کے صواب دید پر موقوف رہے گا۔

۵۔ فوجیوں کی جو تنخواہ انگریزوں کے ذمے رہ گئی، وہ بھی ادا کی جائے گی

یہ شرطیں منظور کر لی گئیں۔ شہاب الدین خاں اور سید برکات احمد نے مندیل میرزا برجیس قدر کے سر پر رکھی اور

---

[1] نوابان اودھ کا ابتدائی لقب "نواب وزیر" تھا۔ مارکوئیس ہیسٹنگز نے شاہ دہلی کی قدر و منزلت کم کرنے کی غرض سے غازی الدین حیدر کو بادشاہ بنایا۔ فوجیوں کا مدعا یہ تھا کہ برجیس قدر کے لیے بادشاہی یا غازی الدین حیدر سے پیشتر کی طرح وزارت کا عہدہ تجویز کرنا شاہ دہلی کی رائے پر موقوف رہے۔

مبارکباد دی - فوجی افسروں نے تلوار نذر دکھائی - فیض آبادی توپ خانے کے صوبے دار جہاں گیر بخش نے اکیس توپ سلامی کی سرکیں - ممو خاں کو نائب ریاست بنایا گیا اور ناصرالدولہ خطاب دیا - حقیقت میں حضرت محل تمام امور کے متعلق خود مشورے کرتیں اور سب احکام ان کی منظوری سے جاری ہوتے - شہر میں منادی کرا دی گئی، خلق خدا کی، مُلک بادشاہ دہلی کا اور حکم میرزا برجیس قدر بہادر کا[1] -

دوسرا بیان

مولوی نجم الغنی نے لکھا ہے کہ شہر میں لُوٹ مار کا بازار گرم تھا - ہزاروں رئیسوں کے گھربار ویران ہو چکے تھے - راجا جے لال سنگھ نے ان بے اعتدالیوں کو روکنے کی غرض سے حکومت کا انتظام ضروری سمجھا - جب وہ حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور میرزا کی مسند نشینی کی استدعا کی تو حضرت محل بہت مضطرب ہوئیں اور سوچا کہ جس فوج نے آقائے قدیم کے متعلّقین کو اذیت پہنچانے میں تامل نہ کیا، وُہ خدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے - نیز برجیس قدر کی نوعمری کا ذکر کیا - ممو خاں اور حسام الدولہ کی رائے بھی یہی تھی - جب دیکھا کہ سپاہ فتنے کی طرف مائل ہے تو مناسب یہی سمجھا گیا کہ استدعا قبول کر لی جائے - ورنہ جس امر کا اندیشہ ہے، وہ اسی وقت ظہور میں آجائے گا[2] یعنی فوج ہنگامہ بپا کر دے گی اور جبراً برجیس قدر کو حاکم بنائے گی -

اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محل نے مجبوری کی حالت میں برجیس قدر کا حاکم بننا منظور کیا - اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ مانتی -

اگر یہ درست تھا تو انگریزی فوج کے آتے ہی حضرت محل حوالگی پر آمادہ نہ ہوئی ؟ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہو گئے اور اور حضرت محل نے باہر نکل کر جنگ شروع کی یا نیپال جانا چاہا تو انگریزوں نے بار بار پیغام بھیجے تھے کہ واپس آجاؤ اور جہاں چاہو رہو، باقاعدہ وظیفہ ملے گا - ان پیغامات کو کیوں قبول نہ کر لیا ؟ میرے نزدیک یہ بیان حالات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا -

دہلی دربار سے تعلق

برجیس قدر کی حکومت ۵ جولائی ۱۸۵۷ء سے ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء تک رہی یعنی آٹھ مہینے اور گیارہ دن - اس اثنا میں جو کچھ ہوا ان میں پہلا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مرکز دہلی سے رشتہ تعلق استوار کرنے کی کوشش کی گئی اور فوج کے ساتھ بھی یہی عہد ہوا تھا کہ دہلی سے برجیس قدر کے لیے منظوری حاصل کی جائے گی - چنانچہ میر احمد کے فرزند عباس میرزا سفارت کے لیے تجویز ہوئے - وہ حضرت محل

---

[1] یہ تمام حالات قیصر التواریخ جلد دوم سے ماخوذ ہیں - (ص ۲۲۳ - ص ۲۲۷)

[2] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۸۴ - ص ۲۸۵ -

کی مقربہ خاص میرزائی بیگم کے داماد تھے۔

ایک عرضداشت لکھی گئی اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل تحائف سفیر کے حوالے کیے:

ایک تاج مرصع کیسۂ زربیں میں، ایک مروارید مالا، ایک جوڑی نورتن، گلے کا ایک زیور جسے دھکدھکی کہتے ہیں، دست بند مرواریدی، کنٹھہ مرواریدی، ایک سو اکیس اشرفی، ایک ہاتھی حوضہ نقرئی اور جھول کارچوبی، دو گھوڑے ساز نقرہ، دو ہزار روپے خرچ راہ کے لیے دیے گئے۔ ساتھیوں میں سوا سو پیادے تھے، پچیس سوار، دو چوب دار، آٹھ ہرکارے، دو شتر سوار، سولہ کہار، چار فراش مع خیمہ وغیرہ۔

سفیر ۲۳ ذی حجہ ۱۲۷۲ھ (۲۴ اگست ۱۸۵۶ء) کو براہ خیرآباد روانہ ہُوا۔ مراد آباد میں ڈپٹی ولایت حسین خاں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ انگریز جرنیل سے بھی مل لینا چاہیے۔ عباس میرزا نے جواب دیا کہ یہ خیانت مجھ سے نہ ہوگی۔

سفیر پہلے شاہدرہ میں اُترا اور شہر میں خبر بھیجی۔ وہاں استقبال کا انتظام ہُوا۔ مظفرالدولہ نواب سیف الدین حیدر خاں کے مکان میں قیام کیا، اس لیے کہ ان سے دوستانہ تعلق تھا۔

دربار میں حاضری

دہلی کا نظم و نسق اس وقت ابتر تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ سفیر اس کے توسط سے پیش ہو۔ پہلے نواب حامد علی خاں اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔ سفیر کو یہ منظور نہ تھا لہٰذا خستگی راہ کا عذر پیش کر دیا۔ پھر نواب احمد قلی خاں اور زینت محل کے توسط سے سفیر پیش ہُوا۔ مظفرالدولہ بھی ہمراہ تھے۔ بادشاہ نے عرضداشت پر اپنے قلم سے لکھا کہ آفریں ہے برجیس قدر بہادر، تم نے چھوٹے سے سن میں بڑا کام کیا۔ اور وہ تمہارا ملک قدیم ہے۔ آیندہ اور عطا ہوگا۔ سفیر نے تحائف پیش کیے، تحائف کی تفصیل سے واضح ہے کہ بعض بادشاہ کے لیے تھے اور بعض زینت محل کے لیے۔ دست بند مرصع خود حضرت محل نے زینت محل کے لیے بھیجے تھے۔

یہ وہی زمانہ ہے، جب دہلی پر انگریزوں کی گولہ باری شدّت سے جاری تھی۔ سفیر ابھی رُخصت نہ ہُوا تھا کہ انگریزوں کا حملہ ہُوا اور وہ شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ ملکی فوج اور اہلِ شہر باہر نکلنے لگے۔ اس افراتفری کی حالت میں سفیر دہلی سے نکلا اور بہ ہزار خرابی لکھنؤ پہنچا۔[1]

---

[1] سفارت کے حالات قیصر التواریخ جلد دوم میں صفحہ ۲۲۰ - صفحہ ۲۲۲ اور صفحہ ۴۴۸ - ۴۴۹ پر مرقوم ہیں، میرزا غالب نے تحائف کی کیفیت یوں بیان کی ہے: ایک سو اکیس اشرفی، دو گھوڑے، دو ہاتھی، اچھوتے موتیوں کا ایک مرصع تاج، بازو بند الماس کی ایک جوڑی زینت محل کے لیے (کلیات نثر فارسی صفحہ ۳۸۵) میرزا غالب مظفرالدولہ سیف الدین حیدر خاں کے عزیز دوست اور ہم نشین تھے۔ اُنھیں یقیناً مفصل حالات معلوم ہوں گے۔

رزم و پیکار رزم و پیکار کی تفصیل کیفیت یہاں پیش نہیں کی جا سکتی - اس کا اصل مقام تاریخ جنگ آزادی ہے۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حضرت محل خود پردے سے نکل کر نہ فوجوں کی قیادت کر سکتی تھی اور نہ براہِ راست انتظامات اپنے ہاتھ میں لے سکتی تھی - اس کا سارا کاروبار مشیروں کے ہاتھ میں تھا - البتہ اس میں شبہ نہیں کہ نازک سے نازک موقع پر بھی حضرت محل کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا -

برجیس قدر کی مسند نشینی کے وقت اس کے پاس چوبیس ہزار روپے نقد موجود تھے، وہ بے تامل مشیروں کے حوالے کر دیے کہ ضروری خرچ چلائیں - پھر مختلف امرا اور دوسرے اصحاب سے روپے لیے گئے - لیکن سپاہ میں نظم بالکل ناپید تھا - کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو سپہ گری میں ماہر ہوتا - احمد اللہ شاہ موجود تھے لیکن دربار لکھنؤ کے متوسلین کو کسی اجنبی کی قیادت پسند نہ تھی - خود اُن میں سے جو لوگ تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے تھے - وُہ باہمی رقابتوں کے چکر میں پھنس کر بے بس ہو گئے تھے -

تلنگوں کی یہ حالت تھی کہ باتیں بہت بناتے، کام کچھ نہ کرتے - جب سُنتے کہ انگریز پیچھے ہٹ رہے ہیں تو پیشقدمی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے، جب دیکھتے کہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مراجعت و پسپائی میں بھی سبقت کا دامن نہ چھوڑتے -

بیگمات کی حالت بیگمات کی حالت حد درجہ عجیب و غریب تھی - تمام حالات سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں دِل سے برجیس قدر کی مسند نشینی پسند نہ تھی، لیکن کھُلم کھلا مخالفت بھی نہ کر سکتی تھیں - جب خطرے کی خبر سُنتیں تو بعض نکل جانے کے لیے سواریاں منگواتیں، بعض کو غش آجاتا، بعض حضرت محل اور ممو خاں کو گالیاں اور کوسنے دینے لگتیں[1]۔

ایک موقع پر فوج نے فیصلہ کیا کہ جو انگریز بیلی گارد میں محصور ہیں، ان پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا جائے - بیگمات میں سے فخر محل، سلیمان محل، شکوہ محل، فرخندہ محل، یاسمین محل، محبوب محل، خورد محل، سُلطان جہاں محل وغیرہ نے حضرت محل سے کہا:

> تم سب طرح سے اچھی رہیں - تمھارا بیٹا بادشاہ ہوا، مبارک ہو - مگر ہم سب بے وارث ہوئی جاتی ہیں - کل فوج کا یہ ارادہ سُنا ہے - اَب تمھیں انصاف کرو، پھر بادشاہ اور محلات وغیرہ جتنے کلکتہ میں ہیں، زندہ بچیں گے یا سب پھانسی دیے جائیں گے؟

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۷۰

ایسی سلطنت کو چولھے میں ڈالو۔ جناب عالیہ (حضرت محل) نے برہم ہو کر جواب دیا،
معلوم ہُوا تم سب ہمارا بُرا چاہتی ہو بلکہ اس سلطنت کے ہونے سے جلتی ہو۔ مختصر یہ کہ
اس وقت آپس میں ایسی جلی کٹی ہوئی کہ جناب عالیہ برجیس قدر کو لے کر اندر کے
دالان میں چلی گئیں[لہ]۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے احوال وظروف میں کسی زبردست مجاہدانہ اقدام کے لیے کیا گنجائش تھی۔ جو لوگ مخلص تھے، وہ بہت پریشان ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا جھگڑا ان کے کانوں تک پہنچا تو حضرت محل کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے سب بیگمات انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس میں ہماری تمہاری خرابی ہے۔ پھر کہیں ٹھکانا نہ ملے گا[عہ]۔

بہترین فرصت

جنگ آزادی میں کسی بھی شہر کو اصلاحِ احوال، نظمِ امور، ترتیب عساکر اور استحکام وضعیت کے ایسے مواقع نہ مل سکے جیسے لکھنؤ کو ملے۔ سرسری نقشہ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ آغاز میں انگریزی فوج بیلی گارد (ریزیڈنسی) کے اندر محصور ہو گئی تھی۔ اس وقت سر ہنری لارنس تمام معاملات کا مالک ومختار تھا۔ وہ ۲؍ جولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر زخمی ہُوا اور فوت ہو گیا۔ اس کے بعد محصورین سے بیلی گارد خالی کرا لینا قطعاً مشکل نہ تھا۔ اسے کمک نہ مل سکتی تھی۔

۲۔ جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کان پور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع کی لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳۔ ۴؍ اگست اور ۱۲؍ اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی شروع کی لیکن دونوں مرتبہ مراجعت ہی پر مجبور ہُوا۔

۴۔ ہیوے لاک کی جگہ آؤٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے۔ لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵۔ نومبر میں سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہُوا لیکن کان پور کے حالات اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس چلا گیا۔

۶۔ فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہُوا۔

گویا اہلِ لکھنؤ کو کم وبیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش

لہ قیصر التواریخ جلد دوم صـ ۲۱۲ ، عہ ایضاً صـ ۲۶۲-۲۶۷

حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے سے ساتھ جوش و خروش اور عزم و ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لیے موجود ہوتا۔

فوج کی دل دہی مختلف لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اُسے بہت رنج ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا: توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمہیں اور دوں گی۔[1] ۲۳ ستمبر ۱۸۵۸ء کو ہوپ گرانٹ اور اَوٹرم کی پیش قدمی کے وقت تلنگے پیچھے ہٹے تو راجا مان سنگھ نے آٹھ نو ہزار سپاہی لے کر زبردست مقابلہ کیا۔ دست بدست لڑائی میں گورے بھی بہت مارے گئے اور راجا کی سپاہ میں سے بھی دو ہزار کھیت رہے۔ حضرت محل نے اس جانفشانی و جاں نثاری پر راجا کو "خطاب فرزندی" عطا کیا۔ خلعت، دو شالہ، رومال کے علاوہ ملبوس خاص میں سے دوپٹا تھا، جو سب سے بڑا اعزاز تھا۔ نیز اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: بعد فتح روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی۔[2] افسوس انتہائی کوششوں کے باوجود لڑائی کا رنگ بگڑتا گیا اور حالات ناساز گار ہوتے گئے۔

انگریزوں کے پیغامات اَوٹرم نے اس دوران میں بار بار حضرت محل کے پاس پیغامات بھیجے کہ لڑائی چھوڑ دیجیے:

۱۔ پہلے پیغام کا مفاد یہ تھا کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافق عہد شجاع الدولہ ملے گا۔

۲۔ پھر کہلوا بھیجا کہ لڑائی چھوڑ دو ملک حوالے کر دیا جائے گا۔

۳۔ آخری مرتبہ کہا کہ پچیس ہزار روپیہ ماہوار ملیں گے۔

معلوم نہیں حضرت محل تک یہ پیغام پہنچے یا نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخری پیغام پر نواب ممو خاں اور ارکان دولت نے کہلوا بھیجا ہمیں کیوں کر یقین ہو کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ درست ہے اور فریب نہیں؟ معلوم ہے لڑائی میں دھوکا اور فریب جائز سمجھا جاتا ہے۔ اگر اپنا وعدہ انجیل پر لکھ کر مُہر کر دو نیز کسی مسلمان بادشاہ کی گواہی اس پر کرا دو تو ہم سمجھیں کہ وعدہ قابل توجہ ہے۔ کسی نے کہا کہ مسلمان بادشاہ یہاں کہاں ہے، جس کی گواہی کرائی جا سکے؟ ممو خاں نے جواب دیا کہ رانا جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال تو انگریزوں کے ساتھ فوج لیے لکھنؤ میں بیٹھا ہے۔ ہم اسی کی گواہی کو کافی سمجھ لیں گے۔[3] آخر یہ تجویز بھی بیچ ہی میں رہ گئی۔

لکھنؤ میں آخری اوقات انگریزی توپوں کی گولہ باری بڑے زور سے جاری تھی۔ لیکن حضرت محل نے مقابلہ جاری

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۲۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۶۲-۲۶۷۔ [3] ایضاً صفحہ ۳۲۴-۳۲۵۔

رکھا۔ ایک موقع پر اُن کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں :

اگر گورے اس وقت سیدھے مکان فرحت افزا میں قریب چوکھی کے چلے آتے تو کیا عجب ہے کہ اس وقت جناب عالیہ، برجیس قدر مع صاحبات محل سب کو گرفتار کر لیتے[1]

خان علی خاں نے زبردست مقابلہ کیا۔ گورے قیصر باغ میں داخل ہو چکے تھے :

چمن پر نہر خون جاری تھی۔ ہر طرف لاشوں کا انبار تھا۔ گورے سمت کو سنگین بارہ دری میں ہو رہے تھے۔ پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آکر باڑھ ماری۔ سیکڑوں گر پڑے آخر سب بھاگے۔ خان بھی زخمی ہوئے[2]

قیصر باغ سے نکلنا

آخر حضرت محل کو قیصر باغ چھوڑنا پڑا۔ اور کس حالت ۱۴ ۶ - مارچ کو وہ دوسری بیگمات اور شاگرد پیشہ عورتوں کے ساتھ ملازمین باغ کے کوٹھوں پر سے ہوتی ہوئی گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے باہر نکلی۔

حلقہ عورات صف بستہ ان کے پیچھے، برجیس قدر ایک سید کی گود میں کندھے سے چمٹے ہوئے اوپر غالیچہ اور چاندنی رفع احتمال کو ڈالے ہوئے۔ جس نے راہ میں قافلہ ناموس شاہی کو دیکھا بے اختیار پیٹنے اور رونے لگا...... بہرحال گلیوں میں گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی، ہر قدم پر اُلجھتی ہوئی تبلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کے پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ جواہر علی خاں نے اپنی پینس کہار آگے سے وہاں بھیج دیے تھے۔ قریب زوال شمسی جناب عالیہ مع برجیس قدر اسی پینس میں سوار ہوئیں۔ باقی اور صاحبات محل وہاں سے متفرق ہو گئے۔

غربت کی پہلی منزل

یحییٰ گنج / نخاس اور چوک ہو کر نعل دروازے میں غلام رضا خاں کے گھر اتریں اس نے مصلحت یہی سمجھی خود بھی خطرے سے محفوظ رہے اور حضرت محل کو بھی محفوظ رکھے۔ چنانچہ عرض کیا کہ گورے میرے مکان سے بہت قریب ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی خلاف امر پیش آئے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۳۳ ۔ [2] ایضاً ۔ ایضاً

تو میری روسیاہی کا باعث ہو۔ یہ سن کر حضرت محل وہاں سے نواب شرف الدولہ کے گھر گئیں۔ وہاں وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید نواب اپنا رسوخ بڑھانے کے لیے گرفتار کرا دے۔ یہ خیال آتے ہی محل سرائے حسین آباد میں پہنچیں۔ اسی طرح دو راتیں مختلف مکانوں میں گزار دیں[1]۔

لکھنؤ سے روانگی

۲۹ رجب ۱۲۷۴ھ (۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء) کو شام کے وقت برجیس قدر کو لے کر پینس میں سوار ہوئیں۔ کچھ جواہرات ساتھ لے لیے۔ موسیٰ باغ کے ناکے سے سواری نکلی۔ کسی نے تاریخ کہی*۔ کچھ نہیں کہہ سکتے مسافت کیوں کر طے ہوئی۔ رات بھر کے سفر کے بعد صبح کو بھراؤں پہنچیں۔ وہاں کے زمیندار راجا مردن سنگھ نے نہایت نامناسب برتاؤ کیا۔ چوپال میں ٹھہرایا۔ کھانا مانگا، جواب دیا پک جائے گا تو پہنچا دیا جائے گا۔ پھر کہلوا بھیجا کہ تمھارا ساتھ کیوں کر دیں؟ ہر طرف مینڈک کی طرح اُچھلتی پھرو گی، پیچھے پیچھے انگریز سانپ کی طرح لہرائیں گے[2]۔

ایسی مصیبتیں ہر اُس شخص کو پیش آتی ہیں۔ جو راہ عزیمت میں قدم رکھے۔ مشکل کے وقت اپنے بیگانے بن جاتے ہیں۔ جن کی نگاہیں گوشہ چشم التفات پر جمی رہتی تھیں، وہ طوطا چشمی اختیار کر لیتے ہیں، حضرت محل نے اس سلوک کو صبر سے برداشت کیا۔ پھر محمود آباد اور بسواں باڑی ہوتی ہوئی خیر آباد پہنچیں۔ ہر پرشاد ناظم قسمت خیر آباد اور مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد، ناظم بسواں باڑی نے تین کوس باہر نکل کر استقبال کیا۔ بڑی دھوم دھام اور نقارہ ونشاں کے ساتھ سواری کو شہر میں لے گئے اور مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اُتارا۔ راستے میں دو ہزار روپے حضرت محل پر سے نچھاور کیے۔ سواری شہر میں داخل ہوئی تو سلامی کی توپیں سر کی گئیں[3]۔

اس طرف جانے کی غرض یہ تھی کہ بریلی پہنچیں جہاں انگریزوں کے خلاف محاذ قائم تھا۔ جب اِدھر سے بھی ناسازگار خبریں ملیں تو نیپال کا رُخ کر لیا اور تلسی پور ہوتی ہوئی نیپال کے مقام نیاکوٹ میں چلی گئیں۔

غربت کی زندگی

نیاکوٹ میں قیام کی اجازت رانا جنگ بہادر نے پہلے دے دی تھی اور انگریزوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ بیگم کو حوالے نہ کروں گا۔ کچھ معلوم نہیں کہ گزارا کیوں کر ہوتا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ رانا جنگ بہادر نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نیپال سے جانا صرف آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ ہم اس میں کبھی دخل نہ دیں گے۔

انگریزوں نے ایک مرتبہ اپنے ایک ہم قوم کو برجیس قدر کی تصویر اُتارنے کے لیے نیپال بھیجا تھا۔ غالباً اس کی ضرورت

---

[1] یہ تمام تفصیلات قیصر التواریخ جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۳۷۔ [3] ایضاً ص ۳۶۸۔

* میرزا رمضان علی ناکام   شد جانبِ کوہ سبک
تاریخ روانگی جستم   نیپال شناخت آمد آورز

یوں پیش آئی کہ اندیشہ تھا کہیں کوئی شخص جعلی طور پر برجیس قدر بن کر ہنگامہ بپا نہ کر دے یا ممکن ہے واجد علی شاہ نے اپنے جلا وطن بیٹے کی تصویر منگوائی ہو۔ بہر حال اس مصور نے جہاں تصویر اتاری، انگریزوں کی طرف سے حضرت محل کو یہ پیغام بھی دیا کہ فیض آباد یا لکھنؤ جو مقام پسند ہو، وہاں قیام فرمائیں مشاہرہ فراخور حال ملے گا اور تعظیم و تکریم میں فرق نہ آئے گا۔ البتہ زیادہ ملازم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت محل نے جواب دیا:

> جب کسی کو نوکر نہ رکھ سکیں گے تو وہ روپیہ کس مصرف میں آئے گا؟ مجھے یہاں رہنے میں کیا قباحت ہے؟ آیندہ خدا کو اختیار ہے[۱]۔

لکھنؤ سے جو لوگ ساتھ گئے تھے، وہ آہستہ آہستہ واپس آتے گئے۔ بعض گرفتار ہو کر آئے۔ مرزائی بیگم برابر حضرت محل کے دامن سے وابستہ رہی اور نیا کوٹ ہی میں اس نے وفات پائی۔ خود حضرت محل کی وفات ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ گویا اکیس سال جلا وطنی میں گزارے[۲]۔

مولانا شرر کا بیان مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

> لوگ حضرت محل کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتیں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا، اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا[۳]۔

یہ مصیبت سلطانہ رضیہ کو بھی پیش آئی۔ اس نے پردہ چھوڑا تو مسلمانوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حضرت محل پردے سے نہ نکل سکی اور اصل کام معرض اختلال میں پڑ گیا۔

ضروری گزارش مولانا شرر نے مشیروں اور سپاہیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ تاہم یہ کہہ دینا چاہیے کہ کہیں سپاہی اچھے تھے اور ان سے کام لینے والے اچھے نہ تھے، کہیں کارفرما اچھے تھے اور سپاہی ان کے برابر نہ پہنچ سکے۔ یہ مصیبت اس لیے پیش آئی جنگ آزادی

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم ص۳۶۶، [۲] تاریخ اودھ جلد پنجم ص۲۸۶، [۳] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص۵۹۔

کی آگ اچانک بھڑک اُٹھی۔ نہ سپاہ کو اصلح سالار چننے کا موقع مل سکا اور نہ اعلیٰ درجے کے کارفرماؤں کو سپاہ کی تربیت کے لیے فرصت میسر آئی۔ اس جنگ میں ناکامی کا اصل اور بنیادی سبب یہی تھا۔ حضرت محل کے لیے اس سلسلے میں دوہری مشکلات تھیں۔ رفیقوں کی بے صلاحیتی کے علاوہ وہ مجبور تھی کہ اُنھیں پر بھروسا کرے، اس لیے کہ خود باہر نکل کر صحیح کارکنوں کا انتخاب نہ کرسکتی تھی۔

مولانا فضل حق کے تاثرات

مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی "الثورة الہندیہ" میں حضرت محل کے متعلق اپنے مشاہدات اور تاثرات درج کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ جو لشکر پہلے سے لکھنؤ میں موجود تھے اور جو دہلی سے بھاگ کر آئے تھے، بیگم نے اُن سب کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اُنھیں قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے نوازا۔[1]

۲۔ قومی مقاتلین کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ایسی بُری طرح بھاگے کہ سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے، ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ گئے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت اور اعیان سلطنت نے دغا کی۔[2]

۳۔ نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں ملکہ تھی، محاصرہ کرلیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو مصاحب عورتوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلے میں پیدل تیزی سے پہنچ گئی۔[3]

۴۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس لانے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر دست گیری کو تیار نہ ہوا۔ آخر بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہوکر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ہمراہ لیے چٹیل میدان کی طرف چل کھڑی ہوئی۔[4]

۵۔ پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور ندیوں سے گزری جن سے بغیر کشتی عبور دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اقامت گزیں ہوگئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار پیادے بٹھا دیے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں۔[5]

---

[1] باغی ہندوستان صفحہ ۳۹۱-۳۹۳، [2] ایضاً صفحہ ۳۹۵، [3] ایضاً صفحہ ۳۹۶، [4] ایضاً صفحہ ۳۹۷، [5] ایضاً صفحہ ۴۰۰-۴۰۱۔

۲۔ اس نے انتظامِ رعایا اور حصولِ خراج کے لیے شہروں اور قصبات و دیہات میں عامل بھیج دیے، لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ نیز بھیج دیا۔[۱]

گویا حضرت محل نے آخری وقت تک انگریزوں کے مقابلے بلکہ سرکوبی میں اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

بصیرت و موعظمت

یہ حضرت محل تھی۔ اس نے وہ کام کر دکھایا، جو اس کے بااختیار شوہر سے نو سال کی شاہانہ زندگی میں نہ ہو سکا۔ کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں لیکن مجاہدین آزادی کے لیے حضرت محل نے عمل کا ایک نہایت قابلِ قدر نمونہ تو پیش کر دیا۔ یہ تو بتا دیا کہ عورت کی زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کیا ہوتے ہیں۔ وہ عورت تھی، پردہ دار عورت۔ رزم و پیکار کے آداب و فنون سیکھنے کا اُسے کوئی موقع نہ مل سکا تھا لیکن خدا نے اس کے پہلو میں ایک ہمت مند دل رکھ دیا تھا وہ جانتی تھی کہ غیرت و حمیت کے تقاضے کیا ہیں؟ آزادی تو ایسی شے ہے کہ تہمتاً بھی اس سے کسی کا انتساب ہو تو اس پر رشک ہی آنا چاہیے۔ عرفی لکھ گیا ہے:

حسد بہ تہمتِ آزادی سروم بگداخت !
ایں مرادے است کہ بر تہمت آں ہم حسد است

حضرت محل نے تو واقعی آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ مشہور ہے کہ،

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند !

لیکن حضرت محل نے پردے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کی توفیق مردوں میں سے بھی تھوڑوں ہی کو ملی۔

۱؎ باغی ہندوستان ص ۴۰۱۔

رانی لکشمی بائی

ریاست جھانسی

باجی راؤ پیشوا نے وسط ہند میں پیش قدمی کی تو اُسے ایک علاقہ بطور نذر ملا جس کا مرکز جھانسی تھا۔ پیشوا اس کے انتظام کے لیے اپنی طرف سے جن لوگوں کو مقرر کرتے تھے، انھیں صوبیدار کہا جاتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری حصّے میں وہاں رگھوناتھ راؤ ہری نولکر نام ایک شخص صوبے دار مقرر ہو کر آیا۔ جس کے حسنِ انتظام سے پیشوا بہت خوش ہوا اور اس کی صوبیداری موروثی بن گئی۔

رگھوناتھ راؤ نے ۱۷۹۲ء میں وفات پائی تو اس کا بھائی شیوراؤ صوبیدار بنا اور کم و بیش بیس برس اس منصب پر فائز رہا۔ اس شخص نے پیشوا کی تابعیت کو رسماً تو ختم نہ کیا لیکن عملاً وہ خود مختار ہو گیا اور اس نے ۱۸۰۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کر لیا۔ مطلب یہ کہ اپنے آپ کو کمپنی کی حفاظت میں دے دیا۔

شیوراؤ کے تین بیٹے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا کرشن راؤ فوت ہو گیا تو صوبیداری دوسرے دو بیٹوں میں سے کسی کو دینے کے بجائے کرشن کے بیٹے رام چندر کو دے دی گئی جو ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۵ء تک مسند نشین رہا۔ اسی کے عہد میں پیشواؤں کی سلطنت ختم ہوئی اور جو حقوق سیادت جھانسی میں پیشوا کو حاصل تھے، وُہ انگریزوں کی جانب منتقل ہو گئے۔ اسی کو ولیم بنٹنگ نے صوبیدار کے بجائے "مہاراجا دھیراج" کا خطاب دیا۔

خاندان کی خصوصیت

اس خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر افراد بے اولاد رہے یا کسی کے اولاد ہوئی اور زندہ نہ رہی۔ مثلاً رگھوناتھ راؤ بے اولاد تھا۔ اس کے

بعد رام چندر راؤ بھی بے اولاد تھا۔ اس نے ہندوؤں کی رسم کے مطابق خاندان کی دوسری شاخ کے ایک فرد سداشیو راؤ کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے متبنیٰ کی مسندنشینی قبول نہ کی اور رام چندر راؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ کو راج کی گدی پر بٹھا دیا۔ وہ صرف تین برس زندہ رہا۔ جذامی تھا۔ نہ اس کے کوئی اولاد ہوئی اور نہ وہ انتظامی کاموں پر متوجہ تھا۔ اس وجہ سے ریاست کا انتظام بہت بگڑ گیا۔ ۱۸۳۵ء میں اس نے وفات پائی تو اس کا چھوٹا بھائی گنگادھر راؤ راجا بنا۔ لکشمی بائی اسی کی رانی تھی۔ جس کے حالات ہم لکھنا چاہتے ہیں۔

امرت راؤ

پیشواؤں کی سلطنت میں رگھوناتھ راؤ عرف رگھوبا کی وجہ سے بہت خلل پیدا ہوا۔ اُس کا بیٹا باجی راؤ ثانی مرہٹہ سلطنت کا آخری پیشوا تھا جس نے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں سے شکست کھائی اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن لے کر بٹھور میں جا بیٹھا جو کان پور کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اس کے باپ رگھوبا نے امرت راؤ نامی ایک شخص کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ امرت راؤ نے باجی راؤ ثانی سے تعلقات خوش گوار رکھنے کی کوشش کی۔ جب دیکھا کہ باجی راؤ کوئی معقول طریقہ اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں تو وہ انگریزوں سے مل گیا اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کرا کے بنارس میں جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ مرہٹوں کے متعدد خاندان مختلف حیثیتوں میں چلے گئے۔

لکشمی بائی کے والدین

انھیں خاندانوں میں سے ایک مورو پنت بلونت راؤ تانبے بھی تھا۔ یہ وآئی نام ایک مقام کا رہنے والا تھا جو پونا اور ستارہ کے درمیان واقع ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ امرت راؤ کے ہاں وہ کس خدمت پر مامور تھا اور اسے کیا مشاہرہ ملتا تھا۔ لیکن قرائن سے ظاہر ہے کہ اچھی حیثیت حاصل ہونے ہی کی بنا پر اس نے وطن کو ترک کیا ہوگا۔ اس کی بیوی کا نام بھاگیرتی تھا۔ اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام منو بائی رکھا گیا۔ یہ رانی لکشمی بائی کا پہلا نام تھا۔ ۱۸۳۲ء میں امرت راؤ نے وفات پائی تو اس کا نظامِ امارت بھی درہم برہم ہو گیا۔ ممکن ہے بعض ملازمینِ خاص کے لیے وظیفے مقرر کر دیے گئے ہوں۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ مورو پنت کا وظیفہ چنداں جاذب نہ ہوگا، اس لیے تھوڑی دیر بعد اس نے بنارس کو چھوڑ کر بٹھور میں باجی راؤ کے گھرانے کا قصد کر لیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۸۳۲ء کے بعد بٹھور منتقل ہونے میں کتنی دیر لگی۔ ایک بیان ہے کہ مورو پنت کے نقل مکان کے وقت منو بائی کی عمر تقریباً چار سال تھی۔[1]

---

[1] چارلس کن کیڈ کی کتاب لکشمی بائی (انگریزی)، ص ۲

تاریخ پیدائش

منوبائی کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ بہت اُلجھا ہُوا ہے۔ ساورکر نے تاریخ ۱۸۳۵ء بتائی ہے[1] لیکن اُسے صحیح ماننے میں دِقتیں ہیں۔ مثلاً اوّل منوبائی کی شادی ۱۸۴۲ء میں بتائی گئی ہے[2]، لہٰذا اگر وُہ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئی تو شادی کے وقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ ہندوؤں میں اگرچہ کم سنی کی شادی کا رواج تھا تاہم جس گنگادھر راؤ سے منوبائی کی شادی ہوئی، اس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور وہ اولاد کا خواہش مند تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ سات برس کی بچی کو اس غرض سے منتخب نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے ساورکر نے بٹھور میں منوبائی اور نانا راؤ ڈھونڈو پنت کے باہم کھیلنے یا سواری کرنے یا آلات و اسلحہ کی مشق بہم پہنچانے کا ذکر کیا ہے۔ نانا راؤ کی ولادت قطعی طور پر ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء کی ہے[3]۔ نانا اور منو کی عمر دں میں دس سال کا تفاوت مذکورہ بالا مشاغل کے لیے سازگار معلوم نہیں ہوتا۔ تیسرے ماننا پڑے گا کہ امرت راؤ کی وفات کے بعد مورو پنت تانبے نے کم و بیش سولہ سال بنارس میں گزارے، اس کے بعد وہ بٹھور پہنچا۔ چوتھے کن کیڈ نے صراحتاً لکھا کہ منوبائی کی شادی کا مسئلہ بلوغت کو پہنچنے کے بعد زیرِ غور آیا[4]۔

بنابریں میرا خیال ہے کہ منوبائی کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء ہوگی۔ وُہ بنارس میں پیدا ہُوئی اور تین چار برس کی تھی جب مورو پنت تانبے بنارس کی سکونت ترک کر کے بٹھور پہنچا۔

بٹھور کی زندگی

کن کیڈ نے لکھا ہے کہ بٹھور میں منوبائی نانا صاحب اور اس کے بھتیجے راؤ صاحب کے ساتھ کھیلتی تھی اور سواری بھی کرتی تھی۔ کھُلی آب و ہَوا نے اُس کی صحت پر بہت اچھّا اثر ڈالا۔ وہ خلقاً بھی بڑی خوبصورت اور حسین تھی۔ صحت و تندرستی نے اس کے حُسن کو چار چاند لگا دیے۔

ساورکر کا بیان ہے کہ نانا صاحب اور منوبائی اکٹھے شمشیر بازی سیکھتے۔ نانا صاحب اور راؤ صاحب اتالیق سے تعلیم پاتے تو منوبائی پاس جا بیٹھتی۔ نانا صاحب ہاتھی پر سوار ہوتے تو منوبائی کہتی: کیا مجھے آپ ساتھ نہ بٹھائیں گے؟ کبھی نانا صاحب گھوڑے کی سواری کرتے تو منوبائی کا انتظار کرتے کہ وہ بھی سوار ہو کر آ جائے تاکہ اکٹھے سواری کی مشق کریں[5]۔

شادی

کن کیڈ نے بتایا ہے کہ گنگادھر راؤ والیِ جھانسی کو دوبارہ شادی کی ضرورت پیش آئی تو عام حالات میں

---

[1] ساورکر طبع اوّل صفحہ ۲۴ ، [2] ایضاً صفحہ ۲۶ ، [3] اُسے باجی راؤ ثانی نے ۷۔جون ۱۸۲۷ء کو گود لیا تھا۔ اس وقت نانا راؤ ڈھائی سال کا تھا۔ [4] کن کیڈ کی کتاب صفحہ ۲ ، [5] ساورکر کی کتاب صفحہ ۲۴-۲۵ ۔

وہ اپنے وطن مالوف یعنی مہاراشٹر سے کسی موزوں بیوی کا انتخاب کرتا، لیکن باجی راؤ ثانی نے بہ اصرار کہا کہ منوبائی سے شادی کرلو۔ چنانچہ لمبی گفت وشنید کے بعد پیشوا کی تجویز مان لی گئی اور منوبائی کی شادی گنگا دھر راؤ سے ہو گئی۔ رسم کے مطابق شادی کے بعد منوبائی کا نام لکشمی بائی تجویز ہوا[1]۔ اسی نام سے وہ تاریخ کے ایوان میں جلوہ افروز ہوئی۔ اسی نام سے اس نے شہرت عام پائی۔ منوبائی کا نام کسی کو یاد بھی نہ رہا۔

گنگا دھر راؤ ۱۸۳۸ء میں مسند نشین ہوا تھا۔ کچھ مدت اس کی ریاست انگریزوں کے زیر انتظام رہی اور ۱۸۴۲ء میں واگزار ہوئی۔ تھوڑا سا علاقہ انگریزوں نے حفاظتی فوج کے لیے الگ کر لیا۔

بیوگی

لکشمی بائی نے چند سال بڑے اطمینان سے گزارے۔ ۱۸۵۱ء میں خدا نے اُسے بیٹا دیا۔ گنگا دھر راؤ کی خوشیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ جسے بڑی آرزوؤں اور التجاؤں کے بعد وارث ملا تھا، لیکن یہ خوشی تین ماہ سے زیادہ عمر نہ پا سکی۔ بیٹا فوت ہو گیا، اور گنگا دھر راؤ کو اتنا سخت صدمہ پہنچا کہ وُہ غم سے گھل گھل کر ۱۸۵۳ء میں اپنے پیشروؤں سے جا ملا۔

اس نے خاندان کی دوسری شاخ سے ایک لڑکے کو جس کا نام انند راؤ واسو دیو تھا، متبنیٰ بنا لیا اور اُس کا نام بدل کر دامودر گنگا دھر راؤ رکھا۔ دامودر کی عمر پانچ سال تھی۔ گنگا دھر راؤ نے وفات سے ایک دن پہلے وائسرائے کو خط لکھ دیا تھا، میں بچے کو متبنیٰ بنا چکا ہوں۔ اس کی منظوری دی جائے اور جب تک وُہ بالغ نہ ہو، رانی لکشمی بائی سرپرست و مختار کی حیثیت میں ریاست کا انتظام سنبھالے۔

جھانسی کا الحاق

لارڈ ڈلہوزی اس زمانے میں وائسرائے تھا۔ اس کی پالیسی ہی یہ تھی کہ ریاستوں کو جس حد تک ممکن ہو جلد سے جلد ختم کیا جائے۔ اس نے دامودر گنگا دھر راؤ کو وارث ریاست تسلیم نہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ رام چندر راؤ کا متبنیٰ سداشیو راؤ مقابلے پر دعوے دار ریاست بن گیا، جس کے حق مسند نشینی کو ۱۸۳۵ء میں رد کر کے ریاست شیو راؤ کے خاندان کی طرف لوٹا دی گئی تھی۔ بہر حال فروری ۱۸۵۴ء میں ڈلہوزی نے دامودر گنگا دھر راؤ کی جانشینی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ ریاست بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور رانی لکشمی بائی کے لیے پانچ ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی البتہ شوہر کی ذاتی جائداد رانی ہی کے قبضے میں رہی، جس میں قیمتی جواہرات بھی تھے۔ ابتدا میں رانی نے پنشن لینے سے انکار کر دیا۔ بعد

---

[1] کن کیڈ

ازاں وصول کرنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے خرچ پر چند آدمی استرداد ریاست کے لیے ولایت بھیجے تھے لیکن اس سعی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

شرمناک طرزِ عمل

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں ڈلہوزی کا فیصلہ اصولاً نادرست نہ تھا۔ جب رام چندر راؤ کے متبنیٰ کو مسند ریاست پر بٹھانے سے انکار کیا گیا تھا تو رگھوناتھ راؤ یا گنگادھر راؤ نے اس سے اختلاف نہ کیا تھا، اس لیے کہ معاہدے کے رو سے ریاست شیو راؤ کے خاندان اور اس کے وارثوں کے لیے مقرر تھی۔ پھر گنگادھر راؤ کے متبنیٰ کو کیوں کر وارث ریاست مانا جاتا؟ اگر متبنیٰ ہی کو ریاست ملنی تھی تو اس کا پہلا حقدار یقیناً رام چندر راؤ کا متبنیٰ تھا جو اٹھارہ سال سے انتظار میں بیٹھا تھا۔ تاہم خاص حالات کے پیش نظر دامودر کو تسلیم کر لینا بہت مناسب تھا۔

البتہ الحاق ریاست کے فیصلے کے ساتھ انگریزوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ حد درجہ شرمناک اور اشتعال انگیز تھا۔ میلی سن کے قول کے مطابق اُنھوں نے رانی کے لیے ساٹھ ہزار سالانہ پنشن مقرر کی، ساتھ ہی گنگادھر راؤ کے قرضے رانی کے ذمے لگا دیے۔ رانی نے ہر چند کہا کہ متوفی مہاراج کے قرضے ریاست کے ساتھ جانے چاہئیں، جب ریاست لے لی ہے تو قرضے کیوں مجھ پر ڈالتے ہو، لیکن آگرہ کے حاکم کال ون صاحب نے اصرار کیا کہ قرضے رانی ادا کرے بلکہ اس کی پنشن سے قرضوں کے لیے رقم وضع ہوتی رہے[1]۔

ظاہر ہے کہ یہ سلوک انگریزوں کے متعلق رانی کے دل پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہ کر سکتا تھا اور کوئی حق شناس انسان اس سلوک کو زیادہ سے زیادہ ناروا قرار دینے میں تامل نہ کرے گا۔

ہومز بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ ڈلہوزی کا کوئی فعل نکتہ چینیوں کے لیے الحاق جھانسی سے زیادہ غیظ آور نہ تھا[2]۔

یہ حالات تھے، جن میں رانی نے تین سال صبر و سکون سے بسر کیے یہاں تک کہ میرٹھ میں جنگ آزادی کی پہلی چنگاری پھوٹی اور تھوڑے ہی دنوں میں جا بجا الاؤ دہکنے لگے۔

انگریزوں پر حملہ

جھانسی میں انگریزوں کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی، اس کی تفصیلات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں اور وہ سب جنگ آزادی کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہاں صرف اتنا جان لینا چاہیے

۱؎ میلی سن کی کتاب جلد دوم صفحہ ۱۲۱ حاکم آگرہ کا نام COLVIN تھا۔ ۲؎ ہومز کی کتاب صفحہ ۴۷۳

کر ادائی جون ہی میں جھانسی کے انگریز افسروں کے بنگلوں کو آگ لگا دی گئی تھی ۔ ۵۔ جون سے ہنگامے کا آغاز ہوگیا ۔ بعض انگریز مارے گئے، باقی جن کی تعداد بل ملا کر پچپن کے قریب بتائی جاتی ہے، شہر چھوڑ کر قلعے میں چلے گئے اور انھوں نے خوب استحکامات کرلیے ۔ تین انگریز افسر اس غرض سے باہر نکلے کہ رانی لکشمی بائی سے امداد لیں لیکن وہ راستے ہی میں مارے گئے ۔ دو پارسیوں نے بھیس بدل کر ناگو اور گوالیار خبر پہنچانے کی کوشش کی، ان کی اصلیت کا پتا چل گیا اور وہ بھی موت کے گھاٹ اتر گئے ۔ کپتان گارڈن، جو جھانسی کا ڈپٹی کمشنر تھا، اتفاقیہ گولہ لگنے سے قلعے میں ختم ہوگیا ۔

حوالگی اور قتل

غرض قلعے کا محاصرہ کرلیا گیا ۔ جو لوگ اس ہنگامے میں پیش پیش تھے ۔ ان کے نام ساورکر نے بتائے[1] ہیں ۔ مثلاً کالے خاں رسالدار، محمد حسین تحصیلدار، حکیم صالح محمد ۔ انقلابیوں کی خواہش یہ تھی کہ جھانسی کا قصہ ختم کر کے جلد از جلد دہلی پہنچیں ۔ لیکن قلعہ فتح کیے بغیر وہاں سے جانا ممکن نہ تھا ۔ انگریزی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ محاصرے کے دوران میں انقلابیوں کو بھی خاصا نقصان پہنچا ۔ بعد کے بیانات مختلف ہیں ۔ ایک کہتا ہے کہ محصورین نے صلح کا سفید جھنڈا لہرایا اور قلعے کا دروازہ کھول دیا اس لیے کہ نہ وہ زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ ان کے پاس اسلحہ یا سامان باقی رہا تھا ۔ دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ محاصرین نے محصورین کو محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ کرلیا تھا انھوں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا ۔

حقیقت حال کچھ ہو لیکن پچاس آدمی زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے ۔ دروازہ کھلا تو ان سب کو قلعے سے نکال کر باغ میں لے گئے اور وہاں موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ رسالدار کا حکم یہ تھا: جن انگریزوں کے متعلق ثابت ہو کہ انھوں نے جھانسی کے الحاق میں حصہ لیا، صرف وہ موت کی سزا کے مستحق ہیں ؛ لیکن جوش میں آئے ہوئے ہجوم نے مجرم غیر مجرم میں کوئی امتیاز نہ کیا یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا ۔ یہ واقعہ بھی ان دردناک واقعات میں سے ہے جن کے متعلق کوئی معذرت پیش نہیں کی جا سکتی ۔

رانی کی ذمہ داری

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ قتل کے لیے رانی کس حد تک ذمہ دار تھی ؟ اس باب میں بھی بیانات مختلف ہیں ۔ انگریز کہتے ہیں کہ رانی نے اسی وقت سے مختلف لوگوں کے

---

[1] ساورکر کی کتاب ص۱۹۵ مسٹر مٹلو (MUTLOW) کا بیان ہے کہ خود رانی نے تحریر کیا تھا کہ محصورین کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے (ہومز: ص۲۲۴ حاشیہ)

پاس قاصد دوڑانے شروع کر دیے تھے، جب میرٹھ کے ہنگامے کے آغاز کی خبر ملی تھی۔ ان میں سے بعض نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جو تین انگریز افسر قلعے سے نکل کر رانی کے پاس فریاد لے گئے تھے، اُنھیں بھی رانی کے حکم سے قتل کیا گیا۔ لیکن اس الزام کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکا۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا ہے کہ رانی کو قتل کے کسی بھی واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بے شک اسے انگریزوں سے سخت کاوش تھی اور جو آزار اس غریب کو پہنچ چکے تھے، وہ یقیناً حد درجہ دل دوز اور صبر آزما تھے۔ ضابطے ضابطہ انسان بھی انگریزوں کے ذلّت خیز سلوک کے بعد ان کے بارے میں خوشگوار خیالات کا حامل نہ رہ سکتا تھا۔ تاہم رائے کا اچھا نہ ہونا ایک بات ہے اور مظلوموں کے لیے بے پروایانہ قتل کا حکم دینا یا انھیں خود قتل کرا دینا بالکل دوسری بات ہے۔ رانی کی طبیعت اور عام اخلاق و عادات کو ایسے کاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ میدان جنگ میں لڑ سکتی تھی اور اس طرح لڑی کہ بڑے بڑے جواں مرد بھی اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کریں گے لیکن بے دست و پا، نہتے اور بے بس آدمیوں کو قتل کرانا اس کا کام نہ ہو سکتا تھا۔

مزید برآں مستند روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ رانی اس وقت تک انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اچانک ہنگامہ بپا ہو گیا ہے اور حتی الامکان جھانسی کو اغیار کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہیے یعنی امن قائم کر کے نظم و نسق درست کر دینا چاہیے، لیکن ہنگامے کے اوائل میں امن قائم کرنا سہل نہ تھا اور رانی کے پاس فوج نہ تھی جس سے کام لے کر وہ کوئی مؤثر قدم اُٹھا سکتی۔

ایک انگریز کی گواہی

ایک مرہٹہ مورخ نے رانی کے سوانح حیات مرتب کیے تھے اور تمام مخالف و موافق شہادتوں کی چھان بین کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ رانی کو انگریزوں کے قتل سے کوئی بھی علاقہ نہ تھا، دوسری شہادتوں کے علاوہ اس نے مسٹر مارٹن؎ نام ایک انگریز کا ایک خط بھی نقل کیا تھا، جو ۲۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو راجا گنگادھر راؤ اور رانی لکشمی بائی کے متبنیٰ دامودر گنگادھر راؤ کے نام لکھا گیا تھا۔ مارٹن خود ہنگامے کے وقت جھانسی میں موجود تھا، لیکن دار و گیر اور کشت و خون سے بچ گیا اور ۱۸۹۴ء تک زندہ تھا۔ وہ لکھتا ہے:

تمھاری غریب والدہ (رانی) سے نہایت غیر منصفانہ اور بے دردانہ سلوک ہُوا۔ ۔ ۔ ۔

اس کے صحیح حالات جس طرح میں جانتا ہوں، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اس غریب نے

؎ MARTIN

جون ۱۸۵۷ء میں جھانسی کے فرنگی باشندوں کے قتل میں قطعاً کوئی حصّہ نہ لیا۔ اُس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ جب فرنگی قلعے میں چلے گئے تو رانی دو روز تک اُن کیلئے سامان خوراک بہم پہنچاتی رہی۔ اس نے کرایہ پر ایک سو بندوقچی منگوائے اور ہماری حفاظت کے لیے بھیج دیے۔ لیکن اُنھیں ایک دن قلعے میں رکھ کر شام کے وقت واپس بھیج دیا گیا۔ پھر رانی نے میجر سکین[1] اور کپتان گارڈن[2] کو مشورہ دیا کہ فوراً دتیا چلے جائیں اور اپنے آپ کو وہاں کے راجا کی حفاظت میں دے دیں۔ لیکن یہ بھی نہ کیا گیا۔ انجام کار اُنھیں ہماری فوج، پولیس اور جیل کے ملازموں نے موت کے گھاٹ اتار دیا[3]۔

یہ خط واقعہ قتل سے رانی کی برأت کا روشن ثبوت ہے۔

تین لاکھ کا مطالبہ

کن کیڈ کا بیان ہے کہ قلعے کے تخلیے اور انگریزوں کے قتل سے فراغت کے بعد تمام انقلابی رانی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم دہلی جانا چاہتے ہیں، آپ ہمیں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے دیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میں تین برس ہوئے ریاست سے الگ ہو چکی ہوں۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟ یہ جواب درست تھا۔ رانی کے پاس حقیقتاً نقد روپیہ نہ ہو سکتا تھا۔ نیز اس سے ثابت ہے کہ نہ رانی نے انقلابیوں کے کسی فعل میں حصّہ لیا تھا اور نہ وہ اُنھیں اُکسانے اور برانگیختہ کرنے کی ذمّہ دار تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو انقلابی اس انداز میں روپے کا مطالبہ کیوں کرتے؟

تاہم انقلابی ایسے کسی جواب پر کیوں کر مطمئن ہو سکتے تھے؟ وہ جانتے تھے کہ رانی کے متبنیٰ دامودر گنگا دھر راؤ کا رقیب رام چندر راؤ کا متبنیٰ سداشیو راؤ ریاست کا طلبگار بیٹھا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے رانی سے کہہ دیا کہ اگر تین لاکھ نہ ملیں گے تو ہم محل کو آگ لگا دیں گے اور سداشیو راؤ کو مسند حکومت پر بٹھا دیں گے۔

رانی کے لیے یہ دھمکی سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ محل کو آگ لگ جاتی تو جو اندوختہ اس کے پاس باقی رہ گیا

---

[1] SKENE جھانسی میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ [2] GORDON جھانسی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ [3] کن کیڈ کی کتاب صفحہ ۱۲-۱۳۔ خط سے ظاہر ہے کہ مارٹن خود محاصرے کے وقت قلعے میں موجود تھا۔ وہ کس طرح بچ نکلا؟ اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ رانی کے بھیجے ہوئے بندوقچیوں کو اس لیے باہر بھیج دیا ہوگا کہ انگریز ان پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ تاہم رانی اس کے سوا ان کی کیا مدد کر سکتی تھی۔

تھا، وہ جل جاتا۔ نیز انگریز اگرچہ جھانسی پر قابض ہو چکے تھے۔ تاہم رانی کو اُمید تھی کہ اُسے واپس لے لے گی۔ اگر سداشیوراؤ مسند نشین ہو جاتا تو رانی کی وہ اُمید بھی ختم ہو جاتی جو اگرچہ آج ہمیں سراسر بے بُنیاد معلوم ہوتی ہے۔

اعلانِ حکومت

بہرحال اس دھمکی سے متاثر ہو کر اس نے ایک لاکھ کے جواہرات انقلابیوں کے حوالے کر دیئے[1]۔ جواہرات مل گئے تو اُنھوں نے رانی کی حکومت کا اعلان کر دیا اور مُنادی ہو گئی: خلقت خُدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا[2]۔

حقیقت میں وُہ دامودر کی مختار و سرپرست تھی نہ کہ مستقل حکمران اور یہ امر بہ طور خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رانی نے اپنی حیثیت سے کبھی تجاوز نہ کیا اور دامودر کے حقوق کو کبھی خفیف سا گزند بھی نہ پہنچنے دیا۔ بلکہ وُہ جب تک زندہ رہی، اس نے دامودر کو سینے سے لگائے رکھا۔ اگر کوئی بچّہ رانی کے بطن سے بھی ہوتا تو اس سے زیادہ وہ پیار اور ماما کا مرجع ہرگز نہ بن سکتا، جس کے مظاہرے رانی لکشمی بائی نے دامودر کے تعلق میں کیے۔

نظم و نسق

حکومت کا اعلان ہوتے ہی رانی نے فوج کی فراہمی کا بندوبست شروع کر دیا۔ انگریزوں کا بیان ہے کہ جھانسی کے الحاق پر رانی نے توپیں زمین میں دفن کرا دی تھیں، اب اُنھیں نکال کر استعمال کے قابل بنا لیا گیا۔ جھانسی میں داخلے کے جتنے راستے اور درے تھے، ان کی حفاظت کے انتظامات کر لیے گئے۔ جا بجا فوجی دستے بٹھا دیے گئے۔ لکشمن راؤ کو وزیر اعظم مقرر کیا، لیکن اس نے کام کاج وزیروں یا مشیروں پر نہ چھوڑا۔ ہر معاملے پر خود توجہ کرتی۔ خاصی پڑھی لکھی اور بیدار مغز تھی۔ اپنے قلم سے احکام صادر کرتی مردانہ لباس پہن کر دربار میں بیٹھتی اور تمام لوگوں کی درخواستیں خود سنتی۔ پوری ریاست کا دورہ کیا۔ اس میں تمام مقدمات کے فیصلے موقع پر کر دیے۔ سب جگہ امن ہو گیا، رعایا گُن گانے لگی۔ ایک روایت کے مطابق "انتظام اتنے اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا تھا کہ رانی کو یقین تھا، انگریز گورنر جنرل اس صورت حال کو دیکھتے تو ریاست حسب سابق دامودر گنگادھر راؤ کے حوالے کر دے گا[3]۔"

رانی کو شہسواری میں بھی کمال حاصل تھا اور گھوڑوں کی پہچان بھی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ اپنے رسالے کے لیے وہ خود گھوڑے خریدتی تھی[4]۔

---

[1] کن کیڈ صفحہ ۲۵۹ [2] ساورکر صفحہ ۱۱۶، [3] کن کیڈ صفحہ ۶، [4] ایضاً ایضاً

جھانسی کی حفاظت

رانی انتظامات کی درستی میں لگی ہوئی تھی، لیکن فتنہ انگیزوں نے اسے اطمینان سے کام جاری رکھنے کا موقع نہ دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے سداشیوراؤ نے فوج لے کر جھانسی پر قبضے کے لیے جدوجہد شروع کر دی، وُہ کرمالاڑا کے قلعے میں بیٹھ گیا اور اپنی راجائی کا اعلان کر دیا۔ رانی حکمرانی کی یہ تقسیم کیوں کر گوارا کر سکتی تھی۔ اس نے فوج تیار کی اور خود کمانڈر بن کر کرالاڑا پر حملہ آور ہوئی۔ سداشیوراؤ نے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ رانی نے اُسے جھانسی کے قلعے میں قید کر دیا۔ جب انگریز جھانسی پر قابض ہُوئے تو سداشیوراؤ کو "بغاوت" کے جُرم میں عمر قید کی سزا دے دی۔

سداشیوراؤ کا فتنہ مٹتے ہی اوڑچھا کے بندھیلہ رانا نے جھانسی پر دھاوا بول دیا اور اپنے جرنیل نتھے خاں کو بیس ہزار فوج دے کر بھیجا۔ رانا کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ جھانسی کو اپنی ریاست میں شامل کرے جو ایک زمانے میں بندھیلہ ریاست ہی کا حصّہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس حملے سے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرے۔ رانی بندھیلہ فوج کے مقابلے کے لیے بھی خود نکلی اور نتھے خاں کو شکست فاش دے کر مراجعت پر مجبور کر دیا۔ اس زمانے میں کرنیل ہملٹن گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ تمام حالات کے متعلق ایک مفصل خط بھی اس کے پاس بھیج دیا، لیکن رانی کا قاصد بندھیلوں کے ہاتھ آ گیا اور یہ خط ہملٹن تک نہ پہنچا[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ بندھیلے رانی اور انگریزوں کے درمیان کسی قسم کا ربط ضبط پیدا ہونے کے روادار نہ تھے بلکہ ان کی خواہش یہ تھی کہ رانی کو انگریزوں کی دشمن ثابت کر دیں تاکہ جھانسی کی ریاست اُنھیں مل جائے۔

انگریزوں سے مقابلہ

اس اثنا میں مشہور انگریز جرنیل ہیوروز[2] وسطی ہند میں انقلابیوں کی سرکوبی پر مامور ہو گیا۔ اور جنوری ۱۸۵۸ء میں اس نے مئو سے نکل کر ساگر سے فوجی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اس وقت تک رانی نے انگریزوں کی مخالفت کا فیصلہ نہ کیا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ صحیح حالات سے اُنھیں آگاہ کر کے جھانسی کے مستقبل کا فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق کرائے۔ یہ حقیقت ہے۔ رہا یہ امر کہ اس سے رانی کی وہ مجاہدانہ حیثیت باقی نہیں رہتی، جس کا تصور عام دماغوں میں مدت سے قائم ہے تو اس سے سوانح نگار کو کوئی سروکار نہیں۔ رانی کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ جھانسی کا فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو جائے۔ اس کے لیے وہ کوشاں رہی۔ جب یہ اُمید جاتی رہی اور میدان میں مقابلے کی نوبت آ گئی تو وہ عزم و

---

[1] کن کیڈ ص ۔ ، [2] HUGH ROSE

شجاعت کا ایک ایسا پیکر بن گئی، جس کی کوئی مثال احمد اللہ شاہ کے سوا ہمیں نہیں ملتی۔ عظمت و برتری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے مردانہ وار جہاد کیا جائے۔ ایک بنیاد یہ ہے کہ مقصد وسعت و برتری کے انتہائی معیار پر پورا اُترے یا نہ اترے، تاہم جائز ہو، حق پر مبنی ہو اور اس کے لیے میدانِ عمل میں قدم رکھا جائے تو پھر ایک لمحے کے لیے بھی تامل و تذبذب کو راہ نہ دی جائے اور ہر مصلحت کو نظر انداز کر کے جان کی بازی لگا دی جائے۔ رانی لکشمی بائی نے عظمت و برتری کے دوسرے معیار کا ایسا عملی نمونہ پیش کیا، جو اس کے ہر ہم وطن کے لیے باعث فخر و مباہات ہونا چاہیے اور دُنیا کا کوئی بھی حق شناس و حق آگاہ آدمی رانی کے احترام میں متامل نہیں ہو سکتا۔

جھانسی کا محاصرہ

ہیو روز جھانسی کے سرحدی استحکامات کو توڑتا ہوتا، ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو شہر کے سامنے نمودار ہوا۔ رانی نے اگرچہ حفاظت کے انتظامات ابتدا سے کر رکھے تھے، تاہم اس کی خواہش غالباً اس وقت بھی یہ تھی کہ پوری کیفیت انگریز سالار کو بتا دی جائے اور کشت و خون کو حتی الامکان روکا جائے، لیکن رزم و پیکار کے جوش و خروش میں رانی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکتی تھی۔ مخالفوں کا فیصلہ بہ ظاہر چنداں غیر معقول نہ تھا۔ وہ دہلی کی فتح و تسخیر کے بعد انگریزوں کے ظلم و جور کی خوفناک حکایتیں سُن چکے تھے۔ اُنھیں پنجاب اور بعض دوسرے مقامات کے خونچکاں واقعات بھی معلوم ہو چکے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے کہا کہ معذرتوں اور تصریحوں کا وقت جا چکا۔ انگریزوں کا رنگ ڈھنگ ایسا ہے کہ اگر مصالحت کا راستہ اختیار کیا گیا اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو سب کو پھانسیاں دے دی جائیں گی یا گولیوں سے اڑا دیا جائے گا۔ پھر ذلت کی موت کے بجائے عزت کی کیوں قبول نہ کی جائے؟ مصالحت اور حوالگی میں بچاؤ کا کوئی امکان نہیں۔ ہم لڑیں گے تو ہو سکتا ہے انگریزوں کو شکست دے دیں۔ اس طرح عزت کی موت ہی نہیں عزت کی زندگی بھی نصیب ہونے کا امکان ہے۔ پھر مقابلہ کیوں نہ کیا جائے؟

ہیو روز نے شہر کے اردگرد گھوم پھر کر مناسب مقامات کا معائنہ کیا۔ توپوں کے لیے ایک دمدمہ شہر کے مشرق میں بنوایا، دوسرا شہر کے جنوب میں اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔

اس کی مشکلات

انگریزی فوج کی مشکلات بڑی زیادہ تھیں۔ اوّل جھانسی بڑا محفوظ مقام تھا۔ شہر پر قبضہ کیے

کن گڑھ رشت

بغیر قلعے پر قبضہ کا راستہ صاف نہ ہو سکتا تھا اور دونوں کام بڑی محنت و مشقت اور سرگرمی کے محتاج تھے۔ تسخیر جھانسی کے بعد ہیوروز نے اعتراف کیا:

جب تک جھانسی کو مسخر نہ کر لیا گیا، ہمیں اس کے استحکامات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم سمجھتے تھے کہ قلعے کے صرف جنوبی حصے کو توڑ لینا ممکن ہے لیکن اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا۔ بیرونی دیوار کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر پندرہ بیس فٹ چوڑی ایک اور دیوار تھی اور اس کے پیچھے ایک گہرا تالاب چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا۔[1]

مزید برآں رانی نے جھانسی کے اردگرد دور دور تک کا علاقہ بالکل بنجر بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ گھاس کا ایک تنکا بھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ لہٰذا فوج کے لیے کھانے پینے کے سامان اور جانوروں کے چارے کے انتظام میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ٹہری یعنی اورچھا کے بندھیلہ رانا اور جیاجی راؤ سندھیا والیٔ گوالیار کی امداد شامل نہ ہوتی تو جھانسی کا محاصرہ جاری رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔[2]

محاصرے کا منظر

محاصرہ دو ہفتے سے زیادہ مدت تک جاری رہا اور سترھویں روز شہر کی تسخیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ وقت کا نقشہ ایک عینی شاہد نے یوں پیش کیا ہے:

۲۵ مارچ سے لڑائی میں گرمجوشی پیدا ہوئی۔ دشمن کا توپ خانہ رات دن مسلسل گولے برساتا تھا۔ رات کے وقت توپ کے گولے قلعے اور شہر پر آتے۔ یہ نظارہ بڑا ہی خوفناک تھا۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ پونڈ کے گولے ٹینس کے گیند کی مانند دکھائی دیتے لیکن ان کی مثال دہکتے ہوئے انگاروں کی سی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۲۶ مارچ کو نصف شب کے قریب انگریزی توپ خانے نے شہر کی جنوبی سمت کی تمام توپیں خاموش کر دیں۔ ایک آدمی بھی دمدموں پر نظر نہ آتا تھا۔ سب تقریباً ہمت ہار بیٹھے۔ اس وقت مغربی دروازے کے توپچی نے اپنی توپوں کا رُخ دشمن کی طرف پھیرا۔ تیسری ضرب میں انگریزوں کا بہترین توپچی مارا گیا اور اُن کی توپیں خاموش

---

[1] میلی سن کی کتاب، جلد پنجم صفحہ ۱۲۹، [2] ایضاً صفحہ ۱۱۱۔

ہوگئیں، اس کارنامے پر بائی (رانی) بہت خوش ہوئی اور توپچی کو پازیب اُتار کر دے دی۔ اس بہادر توپچی کا نام غلام غوث خاں تھا اس نے نتھے خاں (سالار اوڑچھا) کے خلاف جنگ میں بھی ایسی ہی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا تھا۔[1]

اسی طرح بتایا گیا ہے کہ ساتویں دن بائیں جانب کی توپیں بیکار ہوگئیں۔ مغرب کے وقت قلعے کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ لیکن رات کے وقت معمار کملوں میں لپٹے ہوئے آئے اور صبح تک دیوار درست کر دی دمدمے پھر بن گئے اور توپیں جوابی گولے برسانے لگیں۔ آٹھویں روز بارود کے ذخیرے میں آگ لگی۔ ہلاک ہونے والوں میں تیس مرد تھے اور آٹھ عورتیں۔[2]

تانتیا توپی کی آمد

رانی نے امداد کے لیے ناناصاحب کو اطلاع بھجوا دی تھی۔ محاصرہ کے دوران میں تانتیا ٹوپے بائیس ہزار فوج اور خاصا بڑا توپ خانہ لے کر آگیا۔ یہ انگریزی فوج کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اگر تانتیا ٹوپے کا مقابلہ کیا جاتا تو پیچھے سے محصورین حملہ کر دیتے اور انگریزی فوج کا ایک بھی آدمی نہ بچتا۔ تانتیا ٹوپے اگرچہ اچھا جرنیل تھا، تاہم اس کی سپاہ اچھی نہ تھی اور حق یہ ہے کہ رانی لکشمی بائی کی طرح کوئی بھی جرنیل اپنی روح شجاعت و ایثار اپنی فوج میں پیدا نہ کرسکا۔ ہیوروز نے اس خطرے کے وقت انتہائی مردانگی دکھائی۔ توپ خانے کی گولہ باری جاری رکھی اور فوج کے ایک حصے کو لے کر وہ تانتیا ٹوپے کے مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں بائیس ہزار آدمی بکھر کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ ساورکر کے بیان سے ترشح ہوتا ہے کہ فوج نے یا تو غداری کی یا اس پر حد درجہ ہراس طاری ہوگیا۔ تانتیا ٹوپے نے پاس کے جنگل کو آگ لگوا دی۔ اس طرح اپنے آپ کو تعاقب سے محفوظ کر لیا لیکن اس شکست نے جھانسی کی تقدیر کا فیصلہ بھی کر دیا۔ جب بائیس ہزار کا لشکر رانی کے لیے مؤثر اعانت کا ذریعہ نہ بن سکا تو اب باہر سے اور کس کمک کی اُمید رکھی جاتی؟

جھانسی کی تسخیر

ہیوروز نے اب یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جھانسی پر یورش کی جائے، مبادا کوئی دوسرا لشکر باہر سے رانی کی اعانت کے لیے آجائے اور معاملہ دگرگوں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نازک مواقع پر خوش نصیبی کی ساعتیں بار بار نہیں آیا کرتیں۔

چنانچہ توپ خانے کی گولہ باری بہت تیز کر دی گئی۔ ۲۔اپریل کو اطلاع ملی کہ فصیل میں خاصا بڑا شگاف پڑ گیا۔

---

[1] ساورکر ص ۳۷۹، [2] ایضاً ص ۳۷۹-۳۸۰

ہے۔ ۳، اپریل کو صبح کے تین بجے حملہ آور دستے شہر میں داخلے کے ارادے سے نکلے۔ رانی کے بہادروں نے جانبازی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ قدم قدم پر مزاحمت کی۔ محل کے سامنے جو بازار تھا، اس کے دونوں طرف آگ لگا دی گئی۔ گرمی اتنی شدت کی تھی کہ بازار میں سے کوئی گزر نہ سکتا تھا۔ رانی کے لشکریوں میں سے ایک بھی نہ تھا جس نے مقابلہ نہ کیا یا اپنی جان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول نہ کی۔ پوری جنگ آزادی کی تاریخ میں ایسے سخت مقابلے کی مثال نہیں ملتی[1]

رانی کی سرگرمیاں

ساورکر نے لکھا ہے کہ رانی اس اثنا میں سرگرمی سے مختلف مورچوں کا چکر لگا رہی تھی۔ کہیں سنہری بازوبند اور قیمتی خلعت تقسیم کرتی۔ کسی کو تھپکی دے کر دل بڑھاتی۔ کسی کی جانبازی کا تحسین مسکراہٹ سے کرتی۔ پھر پکارتی! غلام غوث خاں اور خدابخش، میرے بہادرو توپ خانے کی آتش باری کو زیادہ سے زیادہ ہلاکت خیز بنا دو۔ وہ دیکھو دشمن نے بڑے دروازے کے ساتھ آٹھ مقامات پر سیڑھیاں لگا لی ہیں[2]

خدا جانے رانی نے چند مہینے میں اپنی فوج کو کس بے پناہ جوش سے بھر دیا تھا کہ ایک نے بھی کمزوری کا نام نہ لیا۔ سب لڑے اور مردانگی سے جانیں دیں۔ خدابخش اور غلام غوث خاں بھی شہید ہو گئے۔ رانی کے لیے ان کی موت سب سے بڑا صدمہ تھی۔ ریاست کے ایک قدیمی نمک خوار نے اس نازک موقع پر حاضر ہو کر پوچھا: حضور کا ارادہ کیا ہے؟ رانی نے بے تکلف کہا: میں اپنے ہاتھ سے میگزین کو آگ لگاؤں گی اور یہیں جان دے دُوں گی۔ غیرت مندوں کے لیے دو ہی مقام ہیں، تخت یا تختہ۔

نمک خوار نے عرض کیا کہ آج رات حضور کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ رانی نے فرمایا کہ میں عورت ہوں۔ اگر دشمنوں کے ہاتھ پڑ گئی اور کسی اجنبی کا ہاتھ میرے جسم سے چھُو گیا تو میں اُسے برداشت نہ کروں گی۔ یہیں مر جانا اچھا ہے۔ یہ سُنتے ہی چند جانباز آگے بڑھے اور کہا کہ ہم ساتھ ہیں اور ہماری موجودگی میں کوئی شخص آپ کی طرف

---

[1] یہ تفصیلات میلی سن جلد پنجم سے ماخوذ ہیں۔ [2] ساورکر صفحہ ۳۰۳ ایک انگریزی بیان مظہر ہے کہ ایک موقع پر توپ خانے کے ایک آدمی نے رانی اور اس کی خواصوں کو ایسی جگہ دیکھا جہاں بہ آسانی گولہ پھینکا جا سکتا تھا، لیکن ہیوروز نے اجازت نہ دی۔ فارسٹ جلد سوم صفحہ ۱۹۹ - یہ بیان سراسر افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس سے ظاہر ہے کہ رانی خطرات سے بے پرواہ ہو کر لڑتی رہی۔

اُنگلی بھی اُٹھائے گا تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے[1]

مقابلے کے متعلق ایک اور بیان

ہومز لکھتا ہے: محل کے سامنے جو بازار تھا، اس کے ایک ایک مکان میں شدید مقابلہ ہوا۔ بعض محصورین کو مراجعت کا راستہ نہ ملا تو کنوؤں میں کود پڑے۔ بازار لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ دونوں طرف کے مکانات جل رہے تھے۔ قلعے سے بدستور گولے برس رہے تھے۔ انگریز سپاہی محل میں داخل ہوئے۔ ایک ایک کمرے میں زبردست مزاحمت سے سابقہ پڑا۔ سارا محل قبضے میں آگیا لیکن اصطبل کے ساتھ ایک کمرے میں چالیس سوار موجود تھے۔ اس کمرے کو آگ لگا دی گئی۔ سوار باہر نکلے۔ اُن کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور اندھا دُھند تلواریں مار رہے تھے۔ ایک ایک لڑ کر مرا[2]۔ اس سے مقابلے کی شدت اور رانی کی سپاہ کے جوش و خروش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جھانسی سے روانگی

غرض ۴۔ اپریل کی رات کو لکشمی بائی نے مردانہ لباس پہنا۔ زرہ بکتر سے آراستہ ہوئی منتخب جانبازوں کی ایک جماعت ساتھ لی۔ کچھ جواہرات اُٹھائے۔ دامودر گنگا دھر کو ساتھ لیا۔ محبوب جھانسی پر وداعی نظر ڈالتی ہوئی اور اپنے فرمانبرداروں کا سلام لیتی ہوئی نکلی۔ سب زار زار رو رہے تھے۔ دروازے پر ریاست اوڑچھا کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ اُن سے کہا گیا کہ اوڑچھا کا لشکر ہیوروز کی امداد کے لیے جا رہا ہے۔ صرف ایک کنیز، ایک بارگیر اور پندرہ سپاہی ساتھ تھے[3]۔

فارسٹ نے لکھا ہے کہ ۴۔ اور ۵۔ اپریل کی درمیانی شب میں رانی کا گھوڑا خندق کے اندر پہنچایا گیا۔ وہ ایک برج کی کھڑکی سے نیچے اُتری۔ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اپنے متبنیٰ کو آگے بٹھایا۔ تین سو افغان اور پچیس پیادے ساتھ لے کر روانہ ہوگئی۔ جب سے انگریزی لشکر جھانسی پہنچا تھا، یہ پہلی تاریک رات تھی[4]۔

میرے نزدیک صحیح کیفیت وہی ہے جو پہلے پیش ہو چکی ہے۔ بعض نے افسانہ طرازی کی ہے کہ رانی جھانسی سے پیدل روانہ ہوئی حالانکہ وہ گھوڑے پر روانہ ہوئی تھی۔ ساری رات تیزی سے سفر جاری رکھا، اس لیے کہ تعاقب کا شدید خطرہ تھا اور تعاقب ہوا بھی۔ بھنڈارہ[5] نام ایک مقام میں ناشتہ کیا۔ سادر کر کا بیان درست مانا

---

[1] سادر کر صفحہ ۳۸۵، [2] ہومز صفحہ ۴۹۰، [3] سادر کر صفحہ ۳۸۹، [4] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۲۱۰، چاند کے حساب سے شعبان ۱۲۷۴ھ کی انیسویں یا بیسویں تاریخ ہوگی۔ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند دیر سے نکلا اور رات دیر تک تاریک رہی۔ [5] یہ گاؤں جھانسی سے ۲۲ میل کے فاصلے پر ہے۔

جائے تو دن بھر بھی رانی نے دم نہ لیا۔ ۵۔ اور ۶۔ اپریل کی درمیانی شب میں ایک سو دو میل کا فاصلہ طے کر کے کالپی پہنچ گئی۔[1]

ایک اور بیان فارسٹ کا بیان ہے کہ جو دستہ رانی کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا۔ وہ بروقت بھنڈارہ پہنچ گیا۔ کپتان فاربیز[2] نے لفٹننٹ ڈوکر[3] کو ہدایت کی کہ بھنڈارہ کے اندر سے گزرے اور خود اس کے بائیں جانب سے آگے بڑھا۔ ڈوکر نے بھنڈارہ پہنچ کر دیکھا کہ خیمہ لگا ہوا ہے اور ناشتہ بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا تو اُسے رانی کا ایک دستۂ فوج ملا، جو چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ سب مارے گئے۔ ڈوکر اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ رانی اپنے مشہور سفید گھوڑے پر سوار جا رہی ہے اور صرف چار ملازم ساتھ ہیں۔ ڈوکر نے رفتار تیز کر دی۔ جب رانی کے نزدیک پہنچ گیا تو ایک گولی آئی اور ڈوکر سخت زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ ساتھ ہی تعاقب ختم ہو گیا۔[4]

اس بیان کو درست مانا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ رانی بڑی مشکل سے بچ کر کالپی پہنچی۔

والد کو پھانسی جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ رانی بچ نکلی۔ رانی کی فوج کے بہادروں کا ایک گروہ قلعے کی مغربی جانب ایک اُونچے ٹیلے پر جا بیٹھا اور لڑائی جاری رکھی۔ انگریزی فوج نے اس ٹیلے کو گھیر لیا اور چوٹی پر گولہ باری شروع کر دی۔ پھر پیادہ فوج کا ایک دستہ اُوپر بھیجا گیا۔ بیس کے سوا جھانسی کی فوج کے یہ تمام بہادر مارے گئے۔ اِن بیس نے خودکشی کر لی۔ رانی کا والد موروپنت بلونت راؤ تانبے بھی اسی ٹیلے پر تھا۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح بچ کر دتیا پہنچ گیا۔ دتیا کے دیوان نے اُسے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اس غریب کو پھانسی کی سزا دی گئی۔[5] فارسٹ لکھتا ہے:

> بہتر ہوتا وہ بھی لڑتا ہوا مارا جاتا، لیکن انصاف کا تقاضا دوسرا تھا، اس لیے کہ جو خوفناک جُرم جھانسی میں وسیع خونی المیے پر منتج ہُوا، اس میں سب سے بڑا محرک یہی شخص تھا۔ چند روز کے بعد وہ گرفتار ہو گیا اور اُسے اسی باغ کے ایک درخت پر پھانسی دی گئی، جس میں انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔[6]

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۸۶ ، [2] FORBES [3] DOWKER [4] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۲۱۹ ساورکر نے بھی یہی بیان کیا ہے لیکن اس میں تعاقب کنندہ افسر کا نام بوکر Bowker لکھا ہے جو غالباً چھاپے کی غلطی ہے۔ [5] ساورکر صفحہ ۳۸۶ ، [6] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۲۱۶-۲۱۷

کوچ اور کالپی

رانی کالپی پہنچی نانا صاحب کے بھتیجے راؤ صاحب سے ملاقات کی تو صرف ایک مطالبہ پیش کیا کہ میرے لیے فوج کا انتظام کر دیجیے تاکہ انگریزوں سے لڑوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب رانی کے سامنے انگریزوں کے قلع قمع کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ وُہ جھانسی سے بے دخل ہو چکی تھی۔ ۲۱۔ مارچ سے ۴۔ اپریل تک اپنے بہادروں کو آزادی کے لیے بے دریغ جانیں قربان کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اَب وہ یا تو اصل مقصد کو پورا کرنے کی آرزومند تھی یعنی انگریزوں کا استیصال یا چاہتی تھی کہ خود بھی میدان جنگ میں جان دے دے۔

تانتیا ٹوپے بھی کالپی ہی آگیا تھا۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ ان کے روبرو پُرجوش تقریر کی پھر تانتیا ٹوپے کو سالار بنا کر ہدایت کی کہ انگریزی فوج کے مقابلے پر نکلے۔ تانتیا ٹوپے فوج لے کر کونچ پہنچا، جو کالپی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر جھانسی کی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رانی بھی تانتیا کے ساتھ گئی۔

ہیوروز نے جھانسی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۲۰۔ اپریل کو کالپی کی جانب کوچ کیا۔ ۶ مئی کو اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ تانتیا نے شکست کھائی اور رانی کے لیے کونچ میں ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا۔ وُہ پھر کالپی چلی گئی۔ تانتیا والدین سے ملنے کے لیے چرکی پہنچ گیا۔[1]

کالپی میں سخت مقابلہ ہُوا۔ لیکن انقلابیوں نے وہاں بھی شکست کھائی اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انقلابی فوج بے ترتیب تھی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ نیز سالاری اور قیادت کے جوہر سب سے بڑھ کر رانی لکشمی بائی میں تھے، لیکن اُسے خود مختاری کے ساتھ جنگ کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔

رانی کی بہادری

کالپی کی لڑائی میں بھی رانی نے بہادری و جانبازی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ انقلابی فوج کا ہراول بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ چونکہ اس کی اعانت کا اچھا بندوبست نہ ہو سکا لہٰذا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہُوا۔ رانی نے یہ صورت حال دیکھی :

> تو وُہ شمشیر بہ دست بجلی کی تیزی سے نکلی اور اپنے سُرخ پوش رسالے کے ساتھ انگریزی فوج کے دائیں بازو پر حملہ آور ہُوئی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ انگریزی فوج

---

[1] میلی سن کا بیان ہے کہ فوج کے تمام طبقے کونچ کی شکست کا ذمہ دار تانتیا کو ٹھہراتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ جھانسی کے رسالے نے بھی حقِ استقامت ادا نہ کیا۔ رسالے کے سوار یہ عذر کرتے تھے کہ ہمارے لیے رانی کا بچاؤ ہر شے پر مقدم تھا (جلد پنجم ص ۱۲۵)

کی پیش قدمی رُک گئی اور وہ بے بس ہو کر پیچھے ہٹی۔ ۲۱ سالہ خاتون کا یہ تیز حملہ۔ اس کے گھوڑے کا سرپٹ دوڑنا، اس کی تلوار کا دائیں بائیں دشمن کو کاٹ کاٹ کر پھینکنا! کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر لڑ مرنے پر تیار نہ ہوتا؟ کون تھا جس میں رانی کے طرزِ عمل سے عزم و شجاعت کی نئی روح پیدا نہ ہو جاتی؟ تمام انقلابی نئے جوشِ مردانگی سے معمور ہو گئے۔ لڑائی سرگرمی سے جاری تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ بلکہ میدانی توپ خانے کے فرنگی توپچی ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ اس کے بعد رانی اپنے رسالے کو لے کر توپوں پر جا گری جو ہلاکت بار آگ برسا رہی تھیں۔ انگریز توپچی توپیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اسپ سوار توپ خانے کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر انقلابی ہر سمت سے آگے بڑھنے لگے۔ اُن کے سینے خوشی سے لبریز تھے کہ جو فرنگی مدت سے بچتے چلے آتے تھے، اُن کی سرکوبی کا موقع آگیا۔ لکشمی سب سے آگے جلوہ گر تھی[1]

لیکن یہ بہادری نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ۲۴ مئی کو ہیوروز فاتحانہ کالپی میں داخل ہو گیا۔

نیا نقشۂ عمل

ظاہر ہے کہ اب انقلابیوں کے حالات خاصے پریشان کُن تھے۔ انگریزوں کی پے در پے کامیابیوں نے ہزاروں متذبذب دلوں کو بھی ان کی طرف مائل کر دیا تھا اور انقلابی تحریک کے لیے فضا خاصی ناساز گار ہو چکی تھی۔ عین اس موقع پر رانی لکشمی بائی نے یہ تجویز پیش کی کہ اب جلد سے جلد گوالیار پہنچ کر سندھیا کی فوج کے قومی اور مذہبی جذبات سے اپیل کرنی چاہیے۔ یقینی طور پر تو کسی کو کچھ معلوم نہیں لیکن میلی سن کے نزدیک یہ تجویز رانی کے سوا کسی کے دماغ میں نہ آسکتی تھی۔

وہ لکھتا ہے کہ اس موقع پر انقلابیوں کے چار ممتاز لیڈر تھے۔ راؤ صاحب، نواب باندہ، تانتیا ٹوپے اور رانی لکشمی بائی۔ ابتدائی دو کو اِس لیے خارج از بحث سمجھنا چاہیے کہ ان کی سابقہ کارروائیوں میں نہ کردار کا کوئی جوہر نمایاں ہُوا اور نہ فکر و نظر کی بلندی پائی گئی۔ تانتیا ٹوپے میں بے شک صلاحیت تھی، لیکن ہمارے سامنے اس کے خود نوشتہ حالات موجود ہیں۔ اُن میں کامیاب ترین کارنامے بھی تھے لیکن تانتیا نے قطعاً کوئی اعزاز اپنے لیے مخصوص نہ رکھا[2]۔ البتہ

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۹۱-۳۹۲۔ [2] یہ دلیل کمزور ہے۔ انقلابیوں میں سے اکثر بے غرض لوگ تھے اور وہ تمام کامیابیوں کو جماعت و قوم سے منسوب کرتے تھے۔ اُنھیں ذاتی اعزازات کی قطعاً خواہش نہ تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تانتیا کسی بھی موقع پر بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکا۔

رانی میں ذکاوت کے جوہر بھی تھے اور بے پناہ مردانگی بھی۔ ایسے حالات بھی موجود تھے، جو بلند کارناموں کے نقشے تیار کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔[1]

سندھیا کا فرار

رانی کی اس تجویز کو سب نے بے تامل قبول کر لیا۔ اور تمام انقلابی ۳۰ مئی کی شب میں مرار پہنچ گئے، جو گوالیار کی مشہور چھاؤنی ہے۔ ان کے ساتھ سات ہزار پیادہ فوج چار ہزار سوار تھے اور بارہ توپیں۔

جیاجی راؤ سندھیا اور اس کا وزیر ڈنکر راؤ انگریزوں کے حامی تھے۔ یکم جون ۱۸۵۸ء کو سندھیا صبح کے وقت چھ ہزار پیادے اور ڈیڑھ ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ اس کے ساتھ آٹھ توپیں تھیں۔ توپوں نے گولہ باری شروع کی۔ انقلابی فوج کے دو ہزار سواروں نے ایک ہی ہلّے میں توپیں چھین لیں۔ ساتھ ہی سندھیا کی فوج یا تو انقلابیوں میں شامل ہو گئی یا لڑنے سے انکار کر دیا۔ صرف اس کا محافظ دستہ، جو چھ سو افراد پر مشتمل تھا، عہد وفا پر قائم رہا۔ ان میں سے کچھ مارے گئے۔ باقی تھوڑے سے سواروں کے ساتھ سندھیا بھاگ کر انگریزوں کی پناہ میں آگرہ پہنچ گیا۔ انقلابیوں نے گوالیار میں داخل ہو کر خزانے اور اسلحہ پر قبضہ کیا۔ نانا صاحب کی پیشوائی کا اعلان ہوا۔ راؤ صاحب کو گوالیار کا حاکم بنایا گیا۔ رام راؤ گوبند وزیر اعظم قرار پایا۔ فوج کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا گیا۔[2]

ساورکر کا بیان ہے۔ تانتیا نے اگرچہ ظاہر یہ کیا تھا کہ والدین سے ملنے جا رہا ہوں لیکن حقیقتاً وہ اس فکر میں تھا کہ اگر کالپی کو خالی کرنا پڑا تو کوئی دوسرا مرکز تیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ گوالیار گیا۔ درباریوں، سرداروں اور دوسرے اکابر سے مل کر انھیں ہم نوا بنایا۔ پھر راؤ صاحب کے پاس جا کر گوالیار پہنچنے کی تجویز پیش کی۔

> ۲۸ مئی کو انقلابی امین محل پہنچے۔ محل کے کارداروں نے اُنھیں روکنا چاہا۔ انقلابیوں نے جواب دیا، تم روکنے والے کون ہو؟ ہم پیشوا کے نمایندے ہیں۔ ہم سوراج اور سودھرم کے لیے لڑ رہے ہیں، ہاں دُنیا کو جان لینا چاہیے کہ ہم پیشوا ہیں۔ ہماری جنگ سوراج اور سودھرم کے لیے ہے۔[3]

جنگ مرار

انگریزی فوج تخلیہ کالپی کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ اب زیادہ لڑائی بھڑائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ لیکن جب سُنا کہ انقلابی گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو ہیوروز خود کالپی سے چلا۔ برگیڈیر سمتھ کو

---

[1] جلد پنجم صـ۱۴۴۔ [2] ایضاً صـ۱۴۶-۱۴۷۔ [3] ساورکر صـ۳۹۴۔

جو چندیری کے قریب تھا، حکم بھیجا کہ جلد سے جلد "کوٹہ کی سرائے" پہنچو، جو گوالیار سے پانچ میل جنوب میں ہے۔ ۱۶ جون کو رابرٹ نیپئر بھی ہیوروز سے آملا۔ یہی انگریز جرنیل ہے جس نے بعدازاں وسطی ہند میں انقلابیوں سے لڑائیاں کیں۔ اسی نے تانتیا ٹوپی کو گرفتار کیا تھا۔ اُسے بعدازاں لارڈ نیپئر آف میگڈالا کا خطاب ملا۔

سندھیا کے آدمی ہیوروز کی رہبری کر رہے تھے۔ وہ مرار پہنچا تو اچانک اس پر گولے اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ تاہم تھوڑی دیر میں مرار کی انقلابی فوج نے شکست کھائی۔ ہیوروز اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔

رانی کی کیفیت

ساورکر نے لکھا ہے کہ مرار میں شکست کی خبر سن کر راؤ صاحب نے نواب باندہ کی قیامگاہ کا رُخ کیا اور نواب باندہ نے راؤ صاحب کی قیامگاہ کا:

> اس افراتفری میں صرف رانی مطمئن اور تیار بیٹھی تھی۔ اس کی تلوار بے نیام تھی۔ خوف اور ڈر سے اب اُسے کیا واسطہ تھا؟ وہ اُمید و بیم دونوں کو پاؤں کے نیچے کچل چکی تھی۔ دُنیا کی چیزوں سے اُسے کوئی دِل بستگی نہ رہی تھی۔ صرف ایک جذبہ اور ایک عزم باقی تھا اور وہ یہ کہ جب تک دم میں دم ہے، آزادی کا پرچم اس کی نوکِ شمشیر پر لہراتا رہے...... اس نے راؤ صاحب کی حوصلہ افزائی کی۔ جس حد تک ممکن تھا، بکھری ہوئی فوج کو ازسرِ نو آراستہ کیا اور شرقی دروازے کی حفاظت اپنے ذمّے لے لی۔ جنگ کی اس دیوی کے لبوں پر صرف ایک پُکار تھی: میں اپنی جان کے ساتھ ادائے فرض کے لیے تیار ہوں، تم لوگ اپنا فرض بجالاؤ۔[1]

میدانِ شہادت

رانی نے مردانہ لباس پہنا۔ چندیری دستار سر پر رکھی، مرصع تلوار بے نیام کی اور اپنے زیرِ کمان فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس روز اس کا پیارا گھوڑا موجود نہ تھا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہونا پڑا۔ کوٹہ کی سرائے کے قریب تمام چوکیوں پر اپنے بہادروں کو بٹھا دیا۔ رانی کی دو کنیزیں ہر وقت ساتھ رہتی تھیں۔ ایک کا نام "مندر" تھا، دوسری کا "کاشی"۔ اس روز بھی وہ ساتھ تھیں۔

برگیڈیر سمتھ نے سامان کوٹہ کی سرائے میں چھوڑا اور پیش قدمی شروع کی۔ رانی کی فوج نے سخت مقابلہ کیا۔ ایک

---

[1] ساورکر صفحہ ۲۹۸۔

نالے کے عبور میں انگریزی فوج کو دیر لگی اور حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے۔ ایک مرتبہ سمتھ کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور سوار کے بھی جسم پر جا بجا زخم لگے۔ کلائی بھی اُتر گئی۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں انگریزی فوج نے مشکلات پر قابو پا لیا۔ اب انقلابی بکھرنے لگے۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ انگریزی فوج نشیب میں قدم قدم پر لڑتی ہوئی اُوپر پہنچی:

تورانی بہادری سے انگریزی رسالے کے مقابلے پر جم گئی اس کے ساتھی پیچھے ہٹے تورانی نے اپنے گھوڑے کو روکنا چاہا، لیکن وہ بھی دوسرے گھوڑوں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی دوسروں کے ساتھ بچ نکلتی لیکن چھاؤنی کے پاس کی نہر کو عبور کرتے وقت اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ ایک انگریز سپاہی نے جو پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، رانی کے درجے اور صنف سے بے خبری کی حالت میں کاری زخم لگایا۔ وہ گری اور پھر نہ اُٹھ سکی[1]

یہ ۱۸۔ جون ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔

ساورکر کا بیان

ساورکر کا بیان ہے کہ رانی جم کر مقابلہ کرتی ہوئی، انگریزی فوج کے درمیان گھر گئی۔ اُس نے چاہا کہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی حلقے کو توڑ کر نکل جائے۔ اچانک اس کے کان میں آواز آئی: "میں مری بائی صاحبہ، میں مری"۔ پلٹ کر دیکھا تو یہ اس کی کنیز مندر کی آواز تھی، جسے ایک سپاہی نے گولی ماری تھی۔ رانی نے اس سپاہی کو قتل کر دیا، پھر حلقہ توڑنے کے لیے نکلی۔ سامنے نالہ آگیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ چھلانگ نہ لگا سکا اور کنارے پر چکر کھاتا رہا۔ اس اثنا میں انگریز سواروں نے اُسے نرغے میں لے لیا۔ تلوار چلنے لگی۔ ایک نے پیچھے سے سر پر وار کیا اور سر کا ایک حصّہ کٹ گیا بلکہ آنکھوں کو بھی نقصان پہنچا۔ دوسرا وار سینے پر ہُوا اور وہ گر گئی۔ لیکن جس فرنگی نے اُسے زخمی کیا تھا، اس کا کام تمام کر دیا۔

آخری رسوم

اب رانی کے آخری سانس تھے۔ اس کا وفادار ملازم رام چند راؤ دیش مکھ قریب ہی تھا۔ وہ اس شیر دل مجاہدۂ آزادی کو اُٹھا کر پاس کی ایک جھونپڑی میں لے گیا۔

گنگا داس باوا نے پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پلایا اور بستر کا انتظام کر دیا۔ یوں

---

[1] جلد پنجم ص ۱۵۴۔ ۱۵۵،

جنگ کی یہ دیوی خون میں نہائی ہوئی، بستر پر لیٹ گئی تھوڑی دیر بعد اُس کا مرغِ روح عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گیا۔ رانی نے مرتے وقت جو ہدایات کی تھیں، ان کے مطابق رام چندر راؤ نے دُشمن کی نگاہوں سے بچ بچا کر گھاس کا انبار فراہم کیا۔ اس پر رانی کی ارتھی رکھی۔ غلامی کے مس کی بے حرمتی سے پیشتر رانی کا مردہ جسم آگ کی نذر ہو گیا[۱]۔

تانتیا ٹوپے نے گرفتاری کے بعد اپنے سوانح کے متعلق جو یادداشت تیار کی تھی اس میں لکھا تھا کہ رانی کی ارتھی رام راؤ گوبند نے جلائی تھی[۲]۔

مُلازم کی زبانی

فارسٹ لکھتا ہے کہ رانی کی وفات کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں، لیکن اس کے ملازم کا بیان زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ ذیل میں درج ہے:

رانی کا معمول تھا کہ مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کرتی۔ سُرخ کوٹ، سُرخ پتلون اور سفید پگڑی۔ اس لباس میں کوئی شخص اس کی صنف نہ پہچان سکتا۔ اس کے متوفی شوہر کی برہمنی خواص گوالیاری فوج کے لباس میں ہر لحظ ساتھ رہتی تھی وُہ دونوں (رانی اور خواص) پھول باغ کے دمدمے کے پاس بیٹھی ہُوئی شربت پی رہی تھیں۔ ۴۰۰ بے قاعدہ پلٹن کے چار سو آدمی قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت خطرے کا بگل بجا کر (انگریزی فوج کے) مسلح سوار آپہنچے۔ وہ چالیس پچاس ہوں گے۔ "باغی" بھاگ نکلے۔ صرف پندرہ کے قریب اپنی جگہ جمے رہے۔ (رانی گھوڑے پر سوار تھی) اس کے گھوڑے نے نہر کود جانے میں تامّل کیا۔ اس وقت رانی کے پہلو میں گولی لگی۔ پھر سر پر ایک زخم آیا۔ لیکن وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ مر کر گر پڑی اور پاس ہی کے ایک باغ میں اس کی ارتھی جلائی گئی۔ اس وقت برہمنی خواص کے چہرے پر بھی تلوار کا زخم آیا

---

[۱] ساورکر صفحہ ۴۰۰، یہ بیان غالباً رانی کے مرہٹی سوانح نگار کی کتاب پر مبنی ہے، جس نے واقعات کی خوب چھان بین کی تھی۔

[۲] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۵۷ (ضمیمہ ب)

لیکن شہر میں پہنچ گئی۔ ایک فقیر اور مسلمان کوتوال نے اس کی تیمار داری کی۔ انھیں کے ہاتھوں میں وہ مری اور نومسلمہ کی حیثیت میں اُسے دفن کیا گیا۔[1]

رانی کی شخصیت

رانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کشیدہ قامت، نہایت حسین وجمیل، حد درجہ سرگرم و مستعد، خوددار اور دھن کی پکی تھی۔ جھانسی سے گوالیار تک ہیوروز کو جتنی لڑائیاں پیش آئیں، تقریباً ان سب میں رانی سے مقابلہ ہوا لہٰذا اس انگریز جرنیل کو زیادہ سے زیادہ صحیح رائے قائم کرنے کے موقعے ملتے رہے اس نے اعتراف کیا ہے کہ

"باغیوں" میں رانی شجاع ترین اور قابل ترین فوجی سالار تھی۔

کن کیڈ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ دُشمن سپہ سالار کی تعریف ہی حقیقی تعریف ہے۔ عربی کی مشہور مثل ہے:

الفضل ما شھدت بہ الاعدا

یعنی اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دُشمنوں کی زبان پر بے اختیار جاری ہو جائے۔

ایک اور اعتراف ملاحظہ فرمایئے:

رانی نے اپنے آپ کو نہایت قابل حکمران ثابت کیا۔ اس نے ٹکسال بنائی۔ جہاں جہاں استحکامات ضروری تھے ان کا بندوبست کیا۔ توپیں ڈھلوائیں۔ فوجیں تیار کیں۔ اپنی حکومت کے ہر کام میں وہ ایک مستحکم اور لبریز عزیمت کردار کی رُوح بھر دیتی تھی۔

رعایا میں اسے بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ایک انگریز لکھتا ہے:

یہی اثر و رسُوخ اور کردار کی یہی حکمیت تھی، جسے شاندار اور رُوح افروز جوانمردی نے چار چاند لگا دیے اور چند ماہ بعد اُس نے سر ہیوروز کے زیرِ کمان فوجوں کا مقابلہ اس شان سے کیا کہ اگر سپہ سالار کم اہلیت کا ہوتا تو (رانی کے لیے) کامیابی کا بھی امکان تھا۔

دیر ہے اندھیر نہیں

بہرحال وُہ بڑی نادر شخصیت کی مالکہ تھی۔ ایسے دَور میں پیدا ہُوئی جب اُس کے

---

[1] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۴۸۱-۴۸۲۔ ہومز نے بھی لکھا ہے کہ رانی کی وفات قرابین کی گولی لگنے سے ہوئی (صفحہ ۵۲۱)

جوہروں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے والے بہت کم لوگ تھے اور ایسے حالات و واقعات سے سابقہ پڑا، جن کی تاریکی کے سیاہ پردوں میں سے اس کی عظمت و برتری کی روشنی چھن کر باہر آ ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ وقت آگیا ہے جب رانی لکشمی بائی کے یگانہ اوصاف بچے بچے کی زبان پر ہوں گے اور جن کے ہاتھوں اس نے زندگی میں دُکھ اُٹھائے ان کے نام صرف ظلم و جور، حق کشی و بے انصافی اور بزدلی و بے حمیتی کے مترادف رہ جائیں گے۔

عظیم اللہ خاںؒ

غیر معمولی قابلیت

قابلیت، تدبر، اصابت رائے، پختگی عزم اور صلاحیتِ تنظیم کے اعتبار سے عظیم اللہ خاں ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ ایسے آدمی بہت کم عرصہ وجود میں آتے ہیں۔ ساورکر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جنگ کا یہ ایک نہایت اہم کردار ہے[1]۔ میرا خیال ہے کہ اسے وسیع تر اور سازگار ماحول میں کام کرنے کا موقع ملتا تو اپنی شخصیت کے بہت سے پختہ اور پایدار نقش چھوڑ جاتا، لیکن جس فضا میں قدرت نے اسے پیدا کیا، وُہ ہرگز سازگار نہ تھی۔ جن رفیقوں کے ساتھ اشتراک عمل اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا، وہ عظیم اللہ خاں جیسے دُور اندیش، فہیم اور ہمت ور نہ تھے۔ پھر جس جہاد میں اُسے اپنی خُداداد صلاحیتیں صرف کرنی پڑیں، وُہ اتفاقات کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا۔ انگریزوں نے فاتحیت کے جنون میں ان تمام کرداروں کی عظمت کے نقوش محو کر ڈالے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی کا پرچم کھولا تھا۔ اس طرح عظیم اللہ خاں کی شخصیت بھی نسیان و بے خبری کی تاریکی میں گُم ہو گئی۔

خاندان اور ولادت

عظیم اللہ خاں کے والد کا نام عبد اللہ خاں تھا۔ ان ناموں کی وضع و ترکیب سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا خاندان افغان ہو گا لیکن ایسی کوئی مستند تصریح کسی ماخذ میں نہیں مل سکی۔

---

[1] ساورکر ص ۲۸۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ تاریخ پیدائش کیا ہے۔ وہ ۱۸۵۳ء میں ولایت گیا تو مختلف اصحاب نے اُسے "جوان" ظاہر کیا۔ اس بنا پر قیاس یہ ہے کہ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان اس کی ولادت سمجھنی چاہیے۔ اصل وطن غالباً کان پور تھا، اس لیے کہ وہیں تعلیم پائی۔ وہیں ابتدا میں مدرسی اختیار کی پھر ڈھونڈو پنت عرف نانا راؤ نے اُسے اپنا مشیر و مصاحب بنا لیا۔

ابتدائی حالات

عظیم اللہ خاں کے ابتدائی حالات کی نسبت جو کچھ معلوم ہُوا، یہ ہے کہ اس کی حیثیت مالی اعتبار سے بہت معمولی بلکہ خاصی غریبانہ تھی۔ اس باب میں مختلف بیانات ملاحظہ ہوں:

۱۔ عظیم اللہ خاں بہت غریب پیدا ہُوا۔ پھر خداداد صلاحیتوں کی بناء پر اس نے درجہ بہ درجہ ترقی کی اس کی بے زری کا یہ عالم تھا کہ ایک انگریز گھرانے میں بہرے کے طور پر زندگی شروع کی اور باورچی بھی رہا[1]۔

۲۔ عظیم اللہ خاں نے ایک اینگلو انڈین خاندان میں بہ طور خدمت گار یا پیادہ زندگی شروع کی[2]۔

۳۔ عظیم اللہ خاں کو ایک غریب گھرانے ہی کا نہیں بلکہ ادنیٰ درجے کے خاندان کا فرد قرار دیا جاتا ہے، اور اُسے ایک اینگلو انڈین کے یہاں بوائے کی صورت میں پیش کر کے خانساماں بتایا جاتا ہے[3]۔

یہ بیانات ہر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ عظیم اللہ خاں یا تو بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہُوا یا کم از کم وُہ زندگی کے ابتدائی دور میں اتنا غریب ضرور ہو گیا تھا کہ اسے ایک انگریزی خاندان میں وہ ملازمت کرنی پڑی جو اَن پڑھ لوگ ہی کرتے تھے۔ گویا اس نے گھر پر کچھ تعلیم بھی نہ پائی تھی۔ اغلب ہے والدین اس کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے ہوں۔

انسانی شرف

تاہم عظیم اللہ خاں کی غریبی یا خاندان کا بہ لحاظ پیشہ بہت معمولی ہونا، خود اس کی عظمت پر کیوں اثر انداز ہو سکتا ہے؟ زندگی کا کون سا شرف ہے، جو نسل، نسب یا دولت و ثروت سے پیدا ہوتا ہو؟ دُنیا کے بیشتر بڑے آدمی نہایت معمولی حیثیت سے اُٹھ کر اقبال و ناموری کی اوج گاہوں پر پہنچے۔ بڑائی اس میں نہیں کہ کسی اُونچے خاندان سے تعلق ہو یا ابتدائی زندگی دنیوی سروسامان کی فراوانی میں گزری ہو۔ بڑائی اس میں ہے کہ انسان خُداداد صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھائے۔ اُنھیں دولت اور عزّ و جاہ کے لیے نہیں بلکہ خلقِ خُدا کی بہتری اور بہبود کے لیے صرف کرے۔ خود نسب، خاندان یا دولت میں بڑائی کو محصور ماننا بھی تو انسان کی سرمایہ پرستی، دُنیا پروری اور

---

[1] ساورکر صفحہ ۲۵، [2] ٹریویلین کی کتاب کان پور صفحہ ۴۴، [3] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۰۳،

غرض جوشی کے آثار مذمومہ میں سے ایک اثر ہے۔ قرآن حکیم نے جب یہ اصل پیش کی تھی کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" تو یہی حقیقت واضح کرنا منظور تھا کہ انسانی شرف حسن عقیدہ، حسن اخلاق اور حسن عمل پر موقوف ہے، نہ کہ دولت، خاندان اور نسب پر۔ دُنیا میں انسان کا حقیقی نصب العین تقویٰ ہی رہنا چاہیے۔ یعنی اس کا فرض ہے کہ اپنے خداداد جوہروں کو جلا دے کر راہِ حق و صداقت میں لگا دے۔

تعلیم اور ملازمت

ٹریولین نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے مشکلات و موانع کے باوجود انگریزی زبان اور فرانسیسی سے کامل واقفیت حاصل کر لی۔ بعدازاں وہ کان پور کے گورنمنٹ سکول میں طالب علم بن گیا، پھر وہیں معلمی کے درجے پر پہنچا۔[۱]

ساورکر کا بیان ہے کہ اس نے باورچی گری کے زمانے میں غیر ملکی زبانیں سیکھیں۔ تھوڑی دیر میں انگریزی اور فرانسیسی بے تکلف بولنے لگا۔ ان دو زبانوں میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد اس نے فرنگی کی ملازمت چھوڑ دی اور کانپور کے ایک سکول میں پڑھنے لگا۔ غیر معمولی قابلیت کی بناء پر اسی سکول میں ٹیچر بن گیا۔[۲]

مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ اس نے مشن کے فری سکول میں تعلیم پائی اور وہاں ماسٹر بن گیا۔ نجل نے اپنے روز نامچے میں محمد علی خاں روہیل کھنڈی عرف جمی گرین کی زبانی بتایا ہے:

> میں نے (محمد علی خاں نے) اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کانپور میں گنگا دین سے انگریزی تعلیم پائی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں ملازم اس اسکول میں ہُوئے۔[۳]

غور طلب امور

گویا سب کا اتفاق ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں عظیم اللہ خاں نے اس انگریزی گھرانے میں سیکھیں، جہاں وُہ ادنیٰ حیثیت میں ملازم ہُوا تھا۔ پھر سکول میں داخل ہُوا اور معلم بنا۔ انگریزی کا سیکھنا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن فرانسیسی کس ذریعے سے سیکھی اور کیوں کر اس میں کمال پیدا کیا؟ کیا اس انگریز گھرانے میں فرانسیسی بھی بولی جاتی تھی یا کیا گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی؟

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کو فرانسیسی سے کیوں دلچسپی پیدا ہوئی جبکہ اس زبان میں مہارت پیدا کر لینے سے اُسے اچھی ملازمت، حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکتی تھی؟

---

۱ کان پور ص۴۴ ، ۲ ساورکر ص۲ ، ۳ غدر کے چند علما ص۱۰۳ - ۱۰۴

ہمارے سامنے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم یہ واقعہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کا حافظہ بڑا ہی غیر معمولی ہوگا، اور اُسے قدرت نے اخذ و فہم کی خاص صلاحیت عطا کی ہوگی کہ خانسامے یا باورچی کی حیثیت میں مالکوں سے جو کچھ سُنتا رہا، وہ ٹھیک ٹھیک اس کے ذہن نشین ہوتا رہا۔

انگلستان اور فرانس کے سفر میں عظیم اللہ خاں کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسے دیکھ کر عورتیں بے حد متاثر ہوتی تھیں۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جس انگریز گھرانے میں اس نے ملازمت اختیار کی تھی، وہاں بھی کوئی ایسا ہی ذریعہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنے کا باعث بن گیا؟ ان سوالوں کا جواب قیاسات ہی کی بناء پر دیا جا سکتا ہے، لیکن تاریخ واقعات کا مجموعہ اور حقائق کا ذخیرہ ہے، اس میں قیاسات یا افسانہ بافیوں کے لیے قطعاً گنجایش نہیں۔

نانا سے تعلق

انتظام اللہ خاں شہابی فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں ذہین اور تیز طبع تھا۔ انگریزی زبان میں مہارت کے متعلق اسے اتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ گورنر کان پور آتے تو ان کے لیے سپاسنامہ عظیم اللہ خاں ہی سے تیار کرایا جاتا۔ اس وجہ سے مقامی حکام میں بھی اس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور جب نانا راؤ کو ایک اچھے کارکن کی ضرورت پڑی تو کان پور کے انگریز کلکٹر نے عظیم اللہ خاں ہی کی سفارش کی۔ نانا راؤ پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر ہُوا کہ کچھ مدت بعد اسے اپنا سربراہ کار بنا لیا اور اس سے مشورہ لیے بغیر قطعاً کوئی کام نہ کرتا۔[1]

ٹریویلین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نانا راؤ کے ذاتی و نجی کاروبار کا سربراہ تھا۔[2] ایک اور بیان میں بتایا گیا کہ جب نانا راؤ کو اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے ایک آدمی ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے ایک مرہٹہ صوبیدار کے فرزند کو بھیجنے کی تجویز تھی لیکن بالآخر:

> یہ کام ایک زیرک اور ہوشیار مسلمان کو سونپا گیا، جس کا چہرہ مہرہ، وضع قطع اور طور طریقے بہت خوشگوار تھے۔ طریقِ گفتگو معقول و دل آویز تھا اور اُسے انگریزی زبان کا اچھا علم تھا۔[3]

ساورکر نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان میں قابل و لائق عظیم اللہ خاں کی قابلیت کا شہرہ نانا کے کان تک پہنچا تو اُسے دربار میں بلایا گیا۔ وہاں اس کے دانشمندانہ مشوروں کو نانا بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۱۰۴ ، [2] کان پور ص ۲۴ ، [3] کیمی جلد اوّل ص ۱۰۹

اس سے پوچھے بغیر کوئی بڑا قدم نہ اُٹھاتا تھا[1]

یہ بھی ممکن ہے کہ مقدمہ ولایت سے جانے سے پیشتر ناناراؤ نے اپنی پنشن کے بیچے جو یادداشت حکومت کے پاس کی تھی، وہ عظیم اللہ خاں نے تیار کی ہو یا کم از کم اس کا مشورہ شامل رہا ہو[2]

سفرِ ولایت

غرض ناناراؤ نے جو وفد ولایت بھیجا اس کا رئیس و ترجمان عظیم اللہ خاں ہی کو بنایا۔ اس کی تاریخ ارسال میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ کیئی کا بیان ہے کہ یہ وفد ۱۸۵۲ء کے موسم گرما میں انگلستان پہنچا[3]۔ ساورکر نے تاریخ ارسال ۱۸۵۴ء قرار دی ہے[4]۔ ٹریولین بھی یہی کہتا ہے کہ عظیم اللہ خاں اس وقت لندن پہنچا جب ۱۸۵۴ء کے موسم کا عہد شباب تھا[5]

انتظام اللہ خاں شہابی ۱۸۵۳ء ہی کے قائل ہیں لیکن فرماتے ہیں کہ خرچ کے لیے وفد کو پانچ لاکھ روپے دے دیے گئے تھے اور عظیم اللہ خاں کے علاوہ محمد علی خاں روہیل کھنڈی عرف جیمی گرین نیز نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب بھی ساتھ تھے[6]۔ ایک انگریز بھی اس کام میں شریک تھا، جس کا نام 'بڈل' بتایا گیا ہے[7]۔ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون تھا؟ آیا اُسے ہندوستان سے ساتھ لے لیا گیا تھا یا ولایت پہنچ کر مقرر کیا تھا؟

میرا خیال ہے کہ وفد کے ساتھ خادموں اور لواحقوں کی بھی خاصی تعداد ہوگی۔

اصل مقصد

لندن جانے کا جو اصل مقصد تھا، اس میں نظر بہ ظاہر کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیئی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

> فیصلہ اس سے پیشتر معرض تحریر میں آ چکا تھا۔ کارندوں کے کچھ کہنے یا کرنے سے اس میں رد و بدل نہ ہو سکتا تھا[8]

ساورکر صاحب فرماتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رویہ بڑا سخت تھا۔ شروع میں عظیم اللہ خاں کو سامعہ فریب الفاظ سے ٹالا گیا۔ انجام کار یہ کھرا کھرا جواب دے دیا کہ ہم گورنر جنرل کے فیصلے سے کامل اتفاق کرتے ہیں۔ باجی راؤ متبنیٰ کو باپ کی پنشن پر کوئی حق حاصل نہیں[9]

---

[1] ساورکر ص ۲۷۔ [2] اس یادداشت کا خلاصہ ناناراؤ کے حالات میں پیش کیا جائے گا۔ [3] کیئی جلد اول ص ۱۰۹۔ [4] ساورکر ص ۲۸۔ [5] کان پور ص ۱۴۲۔ [6] غدر کے چند علماء ص ۱۰۵۔ [7] کیئی جلد اول ص ۱۰۹ BIDDEL۔ [8] ایضاً ایضاً۔ [9] ساورکر ص ۲۹۔

مفتی انتظام اللہ خاں شہابی کہتے ہیں کہ اس وفد نے لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی قائم رکھا۔ مگر ڈائرکٹروں نے صاف جواب دے دیا۔ وکلا کو معقول معاوضہ دیا گیا۔ مٹھی بھی گرم کی گئی[1]۔

اس کے برعکس ٹریولین کا بیان ہے کہ عظیم اللہ خاں نے اپنی ناکامی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ان رشوتوں کا نتیجہ قرار دیا جو وہ بورڈ آف کنٹرول اور پریوی کونسل کو دے چکی تھی۔

ہمارے نزدیک روپے کے معاملے میں کسی انگریز ادارے سے حق وانصاف کی اُمید ہی غلط تھی۔ ہندوستان پر انگریزی قبضے کا پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے۔ بے شک اُنھیں بعض اوقات مختلف لوگوں کو روپیہ اس خیال سے دینا پڑا کہ انگریزوں کے مقاصد بہتر طریق پر پورے ہوتے رہیں۔ مثلاً باجی راؤ کو آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن دے دی تاکہ لڑائی ختم ہو جائے اور پیشوا ملک انگریزوں کے حوالے کر کے آرام سے بیٹھا رہے۔ وُہ آٹھ لاکھ روپے کے اس تاوان کو ہمیشہ کے لیے کیوں کر قائم رکھ سکتے تھے؟ اُن کے خیال کے مطابق باجی راؤ بھی خلاف اُمید دیر تک زندہ رہا یعنی ۱۸۱۷ء سے ۱۸۵۱ء تک پورے چونتیس سال آٹھ لاکھ روپے لیتا رہا۔ اب اس کے متبنیٰ کو کیوں کر یہ رقم منتقل کی جاتی؟ وقت گزر چکا تھا مطلب پُورا ہو چکا تھا۔ پھر متعلقہ مُصیبت کو جاری رکھنا انگریزی نقطۂ نگاہ سے سراسر حماقت تھی۔

لندن کی زندگی

اس پہلو کو چھوڑ کر عظیم اللہ خاں نے انگلستان میں جتنا وقت بسر کیا وہ بڑا پُرلطف تھا۔ اس کے متعلق مختلف بیانات ملاحظہ فرمایئے:۔

> ۱۔ اس کا چہرہ مُہرہ امیرانہ تھا، آواز شیریں اور روپہلی، معاصرانہ انگریزی زندگی کے طور طریقوں اور مراسم سے وہ بخوبی آگاہ تھا لہٰذا اہلِ لندن میں بہت ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس کی خوشگوار اور روپہلی آواز، اس کی امیرانہ روش اور مشرقی شان وشکوہ کی وجہ سے متعدد انگریز عورتیں اس کی والہ و شیفتہ بن گئیں۔ اِن دنوں لندن کے باغات اور برائٹن کے ساحل پر اس جواہرات والے ہندوستانی "راجا" کو دیکھنے کے لیے بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ بعض معزز گھرانوں کی انگریز عورتیں شیفتگی کے اس درجے پر جا پہنچیں کہ عظیم اللہ خاں سے ہندوستان چلنے

---

[1] غدر کے چند علما، ص ۱۰۹،

آنے کے بعد بھی اُسے محبت بھرے خط لکھتی رہیں[۱]

۲- عظیم اللہ خاں لندن پہنچا تو معاشرے کے اس حصے نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا، جو اپنے لُطفِ نظر کے اُمیدواروں کی سابقہ حیثیت کے متعلق قطعاً چھان بین نہیں کرتا۔ بہ شرطیکہ وہ ہم وطن یا عیسائی نہ ہو۔ اس طبقے کے عقیدے کے مطابق ہر ہندو لازماً راجا ہوتا ہے جس طرح کہ ہر ماروئی کو شہید اور ہر پولستانی کو محبِ وطن سمجھا جاتا ہے۔ عظیم اللہ خاں بہت جلد فاتحیت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیریں خوشامد کا بہت بڑا حصہ اس نے حاصل کر لیا۔ عورتوں نے باتفاق اس کے حسن کو دل آویز قرار دیا۔ وہ واقعی بہت خوشرو اور بذلہ سنج تھا۔ اُسے دیدہ دلیری میں سے بھی خاصا حصہ عطا ہوا تھا۔ اُس کے پاس جواہرات اور کشمیری شالوں کی بھی کمی نہ تھی۔ سابقہ خدمت گار باہر نکلتا تو اتنا ہی عالی پایہ آدمی معلوم ہوتا جیسے نیپال کا وزیرِ اعظم یا پنجاب کا مہاراجا[۲]

۳- عظیم اللہ خاں نے جب یہ دیکھا کہ جس کام کے لیے اُسے بھیجا گیا تھا، اس میں کچھ ہو نہیں سکتا تو وہ بہ طور خود رنگ رلیاں منانے لگا۔ وہ اپنی خوش لباسی کے باعث بلند پایہ آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس سے اُسے اعلیٰ سوسائٹی میں بار مل گیا۔ کہا جاتا ہے وہ انگریز خواتین کے بدل التفات سے فائدہ اُٹھانے کا مدعی تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک زندہ دِل، خوش مزاج، خوش خو اور عیش پسند آدمی تھا اور ہر بالغ نظر یہی سمجھتا تھا کہ اُسے ہر لحظہ وقتی کامرانیوں کا خیال رہتا ہے[۳]۔

انتظام اللہ خاں صاحب نے فرمایا ہے کہ اسی طرح فرانس کی عورتیں عظیم اللہ خاں کی گرویدہ بن گئی تھیں، مگر وہ راہِ حق پر قائم رہا اور اپنے دامن پر بُرائی کا کوئی دھبہ نہ لگنے دیا[۴]

عورتوں کے متعلق نقطۂ نگاہ

جب عظیم اللہ خاں انگلستان سے واپس ہوا تو قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) بھی ٹھہرا تھا، کریمیا کی جنگ جاری تھی۔ رسل نام ایک انگریز "لندن ٹائمز" کی طرف سے

۱؎ ساورکر ص ۲۵-۲۸ ، ۲؎ کان پور ص ۴۲ ، ۳؎ کیئی جلد اول ص ۱۰۹-۱۱۰ ، ۴؎ غدر کے چند علماء ص ۱۰۲ ۔

جنگی نامہ نگاری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے بعد ازاں ۱۸۵۶ء میں ہندوستان میں بھی نامہ نگاری کی تھی۔ وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ میں چند روز کے لیے میدانِ جنگ سے قسطنطنیہ آگیا تھا۔ وہاں مصری ہوٹل میں مجھے ایک خوشرو، دُبلا پتلا آدمی ملا جس کا رنگ گہرا زیتونی تھا۔ وہ مشرقی لباس پہنتا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی بولتا تھا۔ یہ عظیم اللہ خاں تھا۔ ملاقات کے باقی پہلوؤں پر تو آگے چل کر گفتگو ہوگی یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ رسل کے بیان کے مطابق عظیم اللہ خاں نے لندن کی سوسائٹی میں اپنی کامرانیوں کا ذکر بڑے طمطراق سے کیا اور اُونچے درجے کے لوگوں کے نام وُہ بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ آخر میں بڑے جزم ویقین سے رائے ظاہر کی کہ اگر اہلِ انگلستان نے

عورتوں پر اسی طرح کی پابندیاں عائد نہ کیں جیسی کہ مشرق میں عائد ہیں تو وہ اس طرح
اڑتی ہوئی جل جائیں گی، جس طرح پروانے شمع کی روشنی میں جل مرتے ہیں [1]

اس سے ظاہر ہے کہ عظیم اللہ خاں کا اصل مقصد انگلستان یا یورپ کے تمدن کی ایک بدیہی خرابی واضح کردینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور انسان جب کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرتا ہے تو قباحتیں بیان کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تفصیلات پیش کر دیتا ہے تاکہ سُننے والا نقطۂ نگاہ کو بخوبی سمجھ جائے۔ اس بیان میں بھی عظیم اللہ خاں کی نیک نیتی اور سعیٔ اصلاح ہی نمایاں ہے۔

رنگو باپوجی

لارڈ ڈلہوزی نے نانا راؤ کو باپ کی پنشن دینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ستارا کا راج بھی چھین لیا تھا۔ اور راجا کے متبنیٰ کو جانشین تسلیم نہ کیا تھا۔ چنانچہ رانیوں نے رنگو باپوجی نام ایک مرہٹہ سردار کو اس غرض سے ولایت بھیجا تھا کہ گورنر جنرل کے فیصلے کے خلاف چارہ جوئی کرے۔ وہ سرگرم آدمی تھا اور بڑی محنت اور توجہ سے کام میں لگا رہا۔ اعتراف کیا گیا ہے کہ پیشِ نظر مقصد کے لیے کسی نے ایسی سرگرمی دیکھی نہ گئی جیسی رنگو باپوجی نے دکھائی لیکن وہ بھی ناکام رہا اور دسمبر ۱۸۵۳ء میں واپس آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسکے سفر خرچ میں اڑھائی ہزار پونڈ دیے اور جہاز کا ٹکٹ لے دیا۔[2]

رنگو باپوجی اور عظیم اللہ خاں میں عمر اور مذہب میں نمایاں فرق تھا۔ دونوں کی طبیعتیں بھی یکساں نہ تھیں تاہم دونوں کے مقاصد ایک نوعیت کے تھے۔ دونوں کو یکساں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں کے دل میں یکساں قسم کے جذبات موجزن تھے۔ وُہ ملتے بھی رہے۔ یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں کہ کیا بات چیت ہوتی رہی۔ ساورکر نے ان کی ملاقاتوں

---

[1] رسل کی کتاب، ڈائری ان انڈیا (روزنامچہ ہند) بحوالہ کیٹی جلد اول صفحہ ۶۴۸-۶۴۹، [2] کیٹی جلد اوّل صفحہ ۱۱۰۔

اور مشوروں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان میں سے ایک ستارا کے چھتر پتی کا نمایندہ تھا اور دوسرا چھتر پتی کے وزیر اعظم کا ہمیں چاہیے کہ ان دونوں کو:

ہندو سلطنت کے بچاؤ کا مسئلہ سکون و اخفاء سے حل کرنے کے لیے چھوڑ دیں[۱]۔

کریمیا کا محاذِ جنگ انگلستان سے مراجعت پر عظیم اللہ خاں اور اس کے ساتھی فرانس ہوتے ہوئے غالباً مارسائی[۲] سے جہاز پر سوار ہوئے۔ یہ ۱۸۵۵ء کے موسم گرما کا واقعہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ رسل سے عظیم اللہ خاں کی ملاقات قسطنطنیہ میں ۱۸ جون ۱۸۵۵ء کے بعد ہوئی تھی اور تعارف ایک انگریز فوجی افسر نے کرایا تھا جس کا نام ڈائن بتایا گیا ہے۔ رسل کہتا ہے، خود عظیم اللہ خاں نے مجھے بتایا کہ میں نے ۱۸ جون کی شکست کی خبر مالٹا میں سنی تھی۔ اس وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ پہنچ کر محاذِ جنگ پر جاؤں۔ اس تاریخی شہر کی زیارت کروں جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ ان بڑے رستموں کو دیکھوں جنھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مشترکہ قوت کو شکست دی۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عظیم اللہ خاں کو سیاسی حالات سے کتنی گہری دلچسپی تھی اس نے محض خبر ن لینے پر قناعت نہ کی، خود موقع پر پہونچ کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا واقعی روسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی قوت بے حقیقت ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک زبردست تحریک نہ چلائی جائے اور ملک کو ان کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔

میدانِ جنگ رسل کہتا ہے کہ میں قسطنطنیہ کی اس ملاقات کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا کہ چند ہفتے بعد میدانِ جنگ میں میری جائے قیام پر ایک صاحب پہنچے اور مسٹر ڈائن کی ایک تحریر پیش کی جس میں لکھا تھا کہ میرے دوست عظیم اللہ خاں خندقیں دیکھنا چاہتے ہیں، مہربانی فرما کر ان کی مدد کیجیے۔ میں باہر نکلا تو خود عظیم اللہ خاں موجود تھا۔ میں نے اس کا گھوڑا بندھوایا اور خود سپہ سالار کی طرف روانہ ہوا تاکہ "پاس" لے آؤں۔ غروبِ آفتاب میں کوئی ایک گھنٹہ باقی ہوگا۔ پاس حاصل کرنے میں تھوڑی سی دیر لگی۔ اس اثنا میں روسی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ وہ عموماً اسی وقت گولے برساتی تھیں تاکہ امدادی جماعتوں کے کام میں خلل واقع ہو۔ گولے سیدھے اس [illegible] پڑنے لگے

---

[۱] ساور کر صفحہ ۲۹۔ واضح رہے کہ "چھتر پتی" سیواجی کا لقب تھا اور ستارا کا راجا اسی کی اولاد میں سے تھا۔ پیشوا ابتدا میں سیواجی کے خاندان کا وزیر اعظم تھا۔ ساہو کے زمانے میں وہ سلطنت کا مختار کل بن گیا۔ [۲] فرانس کی جنوبی بندرگاہ جسے عام لوگ مارسیلز کہتے ہیں۔ [۳] Doyen

جہاں عظیم اللہ خاں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک تو اس کی جائے قیام کے بالکل قریب آکر پھٹا۔ میں پاس سے گزرا تو دیکھا کہ عظیم اللہ خاں قبرستان کے احاطے میں پہنچ گیا تھا اور بڑے شوق و محویت سے روسی توپوں کی گولہ باری کا معائنہ کر رہا تھا

میں نے پاس جانے کیا، ساتھ ہی معذرت کر دی کہ خود ساتھ نہ جا سکوں گا اس لیے کہ مجھے ایک جگہ کھانے پر جانا ہے۔ عظیم اللہ خاں نے کہا: بھئی یہ جگہ جنگ کے نظارے کے لیے بڑی اچھی ہے۔ مجھے سب کچھ نظر آرہا ہے۔ چونکہ دیر ہو گئی ہے، اس لیے آپ سے عرض کروں گا کہ پھر کسی روز ملاقات کے لیے تشریف لائیے۔ میں یہاں اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک قیامگاہ پر واپسی کا وقت نہ آجائے۔

رسل نے کھانے کی دعوت دی۔ عظیم اللہ خاں نے معذرت کر دی۔ رات رسل کے خیمے میں اسی کے سفری پلنگ پر بسر کی۔ بہت سویرے اُٹھ کر وہ چلا گیا اور میز پر یہ تحریر چھوڑ گیا:

"عظیم اللہ خاں جناب رسل کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ صاحب کے کریمانہ التفات کا یہ صمیم قلب شکریہ ادا کرے، جس کے لیے وُہ واقعی بے حد ممنون ہے"۔ [1]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس زحمت کا حقیقی مقصد یہی تھا کہ میدانِ جنگ میں انگریزوں کی صلاحیت کا صحیح اندازہ ہو جائے اور عظیم اللہ خاں کے ذہن میں جو منصوبے ترکیب پا رہے تھے، ان کی کامیابی کے لیے یہ اندازہ بہت ضروری تھا۔

بیرونی تعلقات

ولایت کے سفر کی داستان ختم کرنے سے پیشتر یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں نے اس دوران میں اور کہاں کہاں تعلقات پیدا کیے۔ لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ وُہ تین سال یورپ میں رہا۔ بیشتر وقت لنڈن میں گزارا۔ پیرس، قسطنطنیہ اور کریمیا بھی گیا۔

بٹھور میں نانا کا جو محل تھا، اس میں ایک کمرہ یا کہنا چاہیے کہ ایک حصہ عظیم اللہ خاں کے لیے وقف تھا۔ وہاں رابرٹس کو بہت سے خطوط ملے جن میں سے بعض کھولے بھی نہ گئے تھے بیشتر خطوط انگلستان سے تھے۔ جن میں سے ذی منزلت عورتوں کے خطوط کی بھی تعداد خاصی تھی۔ دو خط ایک فرانسیسی کے تھے، جن میں بتایا گیا تھا کہ چندر نگر میں

---

[1] ڈائری ان انڈیا، حوالہ گیتی جلد اول

کچھ کام ہے، اس کا انتظام کر دیجیے۔ خود عظیم اللہ خاں نے بہت سے خط لکھے تھے جو بھیجے نہ گئے تھے۔ ان میں سے دو خط قسطنطنیہ کے ایک صاحب عمر پاشا کے نام تھے۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ سپاہ میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے، اور ہندوستان میں عام صورت حالات نازک ہے۔[1]

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ عظیم اللہ خاں نے حتی الامکان وسیع سیاسی تعلقات کے لیے اچھا انتظام کر لیا تھا رہا یہ امر کہ ان تعلقات سے کچھ فائدہ پہنچنے کی بھی اُمید ہو سکتی تھی یا نہیں تو یہ بالکل جُداگانہ امر ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ جنگ آزادی کے اصل کارکن پیش نظر مقاصد کے لیے کس درجہ سرگرم تھے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ان کے دلوں میں کیسی شدید تڑپ موجود تھی۔

رابرٹس ہی نے بتایا کہ عظیم اللہ خاں نے انگلستان میں ایک دوشیزہ سے منگنی کر لی تھی۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ عظیم اللہ خاں کے بعد ہندوستان پہنچے گی اور ہندوستان ہی میں شادی کی رسم ادا ہوگی۔ اس دوشیزہ کے بھی بہت سے خطوط مجموعے میں شامل تھے۔[2]

ساورکر کا بیان ہے کہ کان پور میں جو اعلان امارت کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عظیم اللہ خاں نے مِصر کے ذریعے سے بھی سیاسی روابط کے لیے سعی کی تھی۔[3] کیئی کا خیال ہے کہ بعض روسی افسروں سے تعلقات پیدا کرنے کا معاملہ بھی غیر اغلب نہیں سمجھا جا سکتا۔[4]

کلکتہ کا ایک واقعہ

لیڈی لوگن کی یادداشتوں میں ایک عجیب واقعہ مرقوم ہے۔ عظیم اللہ خاں جب ولایت کے سفر سے مراجعت پر کلکتہ پہنچا تو پنجاب کا معزول مہاراجہ دلیپ سنگھ ولایت جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا اور بارک پور میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر لوگن مہاراجا کا نگران و اتالیق تھا۔

لیڈی لوگن لکھتی ہے کہ عظیم اللہ خاں بے حیثیت ہی نہیں بلکہ چھوٹی ذات کا آدمی تھا اور اُسے نانا راؤ نے دو وجہ سے اپنا سفیر بنایا تھا، اوّل اس لیے کہ وُہ نانا راؤ کا خاص اور معتمد علیہ مصاحب تھا، دوم اس لیے کہ فرنگی لوگ کی ہتک کی جائے اور بتایا جائے کہ ان لوگوں میں دیسیوں کے درمیان تمیز کی کوئی صلاحیت نہیں۔ لندن میں اُسے والیِ ریاست سمجھ کر استقبال کیا گیا، حالانکہ استقبال کرنے والوں کو صحیح حالات کے متعلق بہتر معلومات ہونی چاہئیں تھیں یقیناً اس پر عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ نے فرنگیوں کا خُوب مذاق اُڑایا ہوگا۔

---

[1] ہندوستان میں اکتالیس سال (انگریزی)، ص ۲۳۹-۲۳۸، [2] ایضاً ص ۲۳۸، [3] ساورکر ص ۶۰، [4] کیئی جلد اوّل ص ۶۴۸۔

یہ شخص مہاراجا سے ملاقات کے لیے آیا۔ سر پر پگڑی تھی اور پاؤں میں انگریزی بوٹ۔

بالائی زینے پر میرے شوہر (ڈاکٹر لوگن) سے ملاقات ہوئی، اس نے بوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم اللہ خاں سے کہا: "معاف کیجیے آپ بھول گئے ہیں"۔ عظیم اللہ پہلے بہت جزبز ہوا۔ پھر اس نے یہ کہتے ہوئے بوٹ اُتارنے سے صاف صاف انکار کر دیا کہ "میں نے انگلستان میں بڑے بڑے امیروں کے سامنے بوٹ نہیں اُتارے اور میں ایسی دقیانوسی اور طفلانہ رسموں کا پابند نہیں"۔

لوگن جانتا تھا کہ یہ طریقہ دلیپ سنگھ کو اس کے ملازموں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا، اس لیے کہ وہ اب مسیحیت اختیار کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے (لوگن نے) کہا۔ انگلستان میں تمہارا کیا رویہ رہا، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، لیکن میں بتا دیتا ہوں کہ ہز ہائینس کے حضور میں جانے سے پیشتر یا تو اپنی پگڑی اُتارو (جو دیسی آدمی کے لیے سب سے بڑی ہتک تھی) یا جوتا ورنہ میں اور یہ چوبدار تمہیں ٹھوکریں مار مار کر سیڑھیوں سے نیچے گرا دیں گے اور تم اسی سلوک کے مستحق ہو۔[1]

افسوسناک طرزِ عمل

ڈاکٹر لوگن بڑا اچھا اور شریف آدمی تھا لیکن دیکھیے عظیم اللہ خاں کی عزت و برتری نے اسے کس درجہ پریشان کر دیا کہ اُسے عام آداب کا بھی خیال نہ رہا:

۱۔ بلاشبہ دیسی رؤسا کے پاس جاتے وقت جوتے اُتارے جاتے تھے لیکن دیسی جوتے نہ کہ بوٹ۔

۲۔ اگر اس قاعدے کی پابندی کرانی ضروری بھی تھی تو معاملے کو نرمی سے سُلجھایا جا سکتا تھا، اس قدر جوش میں آنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ نہ کیا تو سیڑھیوں سے نیچے گرا دیے جاؤ گے؟

۳۔ نانا نے عظیم اللہ خاں کو اس لیے سفیر یا وکیل بنا کر بھیجا تھا کہ اُس میں پیشِ نظر کام کو پورا کرنے کی صلاحیت تھی۔ اُس میں "فرنگی لوگ" کی بے عزتی کا کوئی سوال نہ تھا۔ جس کی طرف لیڈی لوگن نے اشارہ کیا

۴۔ لیڈی لوگن اور دُنیا کے ہر انسان کے لیے عظیم اللہ خاں کی خداداد صلاحیتیں قابلِ توجہ تھیں، اس کے خاندان

---

[1] لیڈی لوگن کی یادداشتیں (انگریزی) صفحہ ۱۰۸-۱۰۹۔

کی غریبی کا ذکر بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا امیروں کا خون غریبوں کے مقابلے میں زیادہ سُرخ و رنگین ہوتا ہے یا اس میں کوئی خاص صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے؟

۵- اِن باتوں سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ذمّہ دار انگریزوں کا رویہ کس درجہ افسوسناک اور نازیبا تھا اور وُہ کس طرح ہر شریف ہندوستانی کی بے عزّتی کے درپے رہتے تھے۔

تنظیمی کوششیں

ہندوستان آجانے کے بعد عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ کی کوششیں تنظیم کے لیے وقف ہوگئیں۔ ان کی تفصیلات نانا راؤ کے حالات میں بیان ہونی چاہئیں اس لیے کہ عظیم اللہ خاں نانا کا رفیق تھا تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خط وکتابت اور ارسالِ سفرا کے علاوہ ایک دورہ بھی کیا گیا جس میں نانا اور عظیم اللہ خاں شہر بہ شہر انبالہ تک آئے۔ البتہ ان کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا حال کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس دورے کو نانا راؤ نے بعض مقدس مقامات کی زیارتوں کا نام دیا تھا۔

اس طرح اپریل ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کا دورہ کیا تھا، جس کی کچھ تفصیلات مارٹن گبنس[1] نے بیان کی ہیں۔ یعنی یہ کہ نانا اور عظیم اللہ خاں نے سر ہنری لارنس سے بھی ملاقات کی۔ وہ بازار میں نکلتے تو خاصے آدمی ساتھ ہوتے۔ گبنس کے دل میں شبہات پیدا ہوئے۔ ہنری لارنس نے ان کی تصدیق کی اس بارے میں گورنر جنرل کو ایک مفصل خط لکھا ساتھ ہی کان پور کی فوج کے سالار سر ہیو ویلر کو بھی اطلاع دے دی[2]۔

کان پور میں تشویشناک حالت

میرٹھ میں ۱۰ مئی کو آزادی کا پرچم بلند کیا جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جگہ جگہ ہنگامے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ان میں سے ایک اہم مقام کان پور تھا، جو نانا راؤ اور عظیم اللہ خاں کا مرکز تھا۔

کان پور کی انگریزی فوج کے سالار جنرل ہیو ویلر[3] نے چھاؤنی میں ایک مرکز تجویز کر کے اُسے مستحکم کر دینے کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ ایک روز عظیم اللہ خاں اُدھر سے گزرا تو اپنے ایک دوست لفٹنٹ سے پوچھا: جس جگہ استحکامات کیے جا رہے ہیں، اس کا نام کیا رکھا ہے؟

لفٹنٹ : مجھے قطعاً معلوم نہیں۔

عظیم اللہ خاں : میرے نزدیک اسے "حصارِ یاس" کہنا مناسب ہوگا۔

---

[1] Martin Gubbins [2] کیئی جلد اوّل صفحہ ۶۳۴-۶۴۵ ۔ [3] Hugh Wheeler

لفٹنٹ: ہرگز نہیں۔ ہم اسے "حصارِ فتح" کہیں گے۔

یہ واقعہ تقریباً سب نے بیان کیا ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ پہلے سے جنگ آزادی کی جو سکیم تیار ہو چکی تھی، عظیم اللہ خاں اس سے پوری طرح آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ چند روز بعد انگریزوں کے دفاعی استحکامات کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

ہنگامے کا آغاز

غرض تشویش میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا تا آنکہ ۴ جون کو ہنگامہ شروع ہو گیا۔ انگریز ان استحکامات میں بیٹھ گئے، جن کا بندوبست پہلے سے ہو رہا تھا، یہی مقام تھا جسے عظیم اللہ خاں نے "حصارِ یاس" قرار دیا تھا اور یقیناً وہ حصارِ یاس ثابت ہوا اگرچہ انگریزی سلطنت ختم نہ ہوئی۔

اصل واقعے کی تفصیلات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں، صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ جس فوج نے آزادی کا علم بلند کیا تھا۔ وہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتی تھی۔ اور نانا راؤ کو بھی ساتھ لے جا رہی تھی۔ لیکن عظیم اللہ خاں نے مشورہ دیا کہ وہاں جانے کی بجائے کانپور میں ٹھہرنا ضروری ہے۔

عظیم اللہ خاں کا مشورہ

عظیم اللہ خاں کے اس مشورے کے باب میں بیانات مختلف ہیں۔ فارسٹ کے علم کے مطابق عظیم اللہ خاں نے کہا کہ مغلیہ دربار میں نانا کی حیثیت گھٹ جائے گی اور اثر بھی زائل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ کان پور پر قبضہ جما کر دائرہ اثر مشرق کی جانب سمندر تک پھیلا لیا جائے۔

> ہندوستان میں فرنگی دیسی فوج کے ایک چوتھائی حصے سے بھی کم ہیں اور اب کہ سپاہیوں نے فرمانبرداری کا جوا اتار پھینکا ہے، انگریزوں کی حیثیت بالکل زائل ہو چکی ہے۔[1]

ٹریولین نے بھی مشورے کا خلاصہ یہی پیش کیا ہے، لیکن اس کی توضیح عظیم اللہ خاں نے یوں کی کہ ہمیں پہلے کانپور کے گرد و پیش کا علاقہ ختم کر لینا چاہیے اور وہ تمام راستے روک لینے چاہئیں جن سے کام لے کر مجاہدین آزادی کے مقبوضہ علاقوں میں کمک پہنچائی جا سکتی ہے، اس طرح پنجاب و دہلی کے دروازے ہمارے ہاتھ آ جائیں گے پھر ہم مجاہدین آزادی کے ساتھ امیر الامرائی کے منصب اور شمالی ہند کی حکمرانی کے لیے بات چیت کر سکیں گے۔ اس وقت لاکھوں بندوقیں اور تلواریں ہماری پشتیبان ہوں گی اور ہم وادیِ گنگا کو مسخر کرتے ہوئے ملعون فرنگی سے انتقام

---

[1] فارسٹ جلد اول صفحہ ۴۰۶

ریشیں نے ، پلاسی کی صد سالہ سالگرہ کے پرن لڑائی کی جائے گی جو پہلی لڑائی سے بالکل مختلف ہوگی۔[1]

ورے کی اہمیت

یہ کہنا مشکل ہے کہ الفاظ عظیم اللہ خاں کے ہیں یا صرف مفہوم اس کا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت تک جمہوریت کا کوئی صحیح تصور پیدا نہ ہوا تھا اور ہر شخص حکومت کو بادشاہ یا حکمران ہی کی شکل میں دیکھتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی مرکزیت کچھ اس کے عزائم آزادی یا صلاحیت ملک داری کی بناء پر پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کی بنیاد و اساس محض یہ تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے اجداد تین سو سال سے حکمران چلے آتے تھے۔ بیسیوں خلل اندازیوں کے باوجود ہندوستانی عوام کے دلوں میں حکومت اور مغلیہ خاندان ایک تھے یا کم از کم لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ نانا راؤ بھی ایک مشہور حکمران خاندان کا فرد تھا۔ اگر اس کی حکومت کا تصور سامنے رہا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

تاہم اصل رائے کی اصابت اور پختگی میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے ؟ ہر مقام کی قوت کو دہلی میں جمع کرتے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزوں کو بھی اپنی قوت ایک مقام پر لے آنے اور مجتمع کر لینے کا موقع مل جاتا نیز دہلی شہر کے وسائل تمام افواج کی ضروریات رسد پوری نہ کر سکتے تھے۔ صحیح راہ عمل یہی تھی کہ جنگ آزادی کے بیسیوں مرکز جا بجا قائم کر دیے جاتے تاکہ انگریزوں کی جو تھوڑی سی قوت باقی تھی وہ بٹ جاتی اور اُسے بہ آسانی ختم کر دیا جا سکتا یہ رائے بھی عظیم اللہ خاں کی سیاسی بصیرت و بالغ نظری اور پختہ کاری کی ایک روشن دستاویز ہے۔

دو مصیبتیں

میدانِ جنگ میں اہلِ ملک کے لیے دو بڑی مصیبتیں تھیں۔ اوّل یہ کہ جو سپاہی بروئے کار آ گئے تھے، ان میں سے بہت کم وقت کی ضرورت کے مطابق جنگی تربیت سے بہرہ مند تھے اور زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو دراصل لڑنے کے قابل نہ تھے۔ جہاں کہیں جم کر مقابلے کی نوبت آتی یا کسی موقع پر انگریزوں کا پلّہ بھاری رہتا تو سب لوگ اُٹھ بھاگتے اگرچہ تعداد میں زیادہ ہوتے حالانکہ جنگ میں نیک و بد دونوں حالتیں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ اُن میں قابل اور تجربہ کار سپہ سالار بہت کم تھے۔ صرف چند لوگوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً احمد اللہ شاہ یا رانی لکشمی بائی۔ اکثر یا تو فنونِ جنگ سے ناواقف تھے یا ان کی حیثیت متوسط درجے کی تھی۔ نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکلا۔

کان پور میں انگریزی سپاہ بہت کم تھی اور ابتدا ہی میں محصور ہو گئی تھی۔ اگر مجاہدین میں سے چند آدمی بھی تجربہ کار

---

[1] کان پور صف

ہوتے تو بہت جلد محصورین کو مسخر کر لیتے لیکن ۴ جون سے ۲۱ جون تک کی گولہ باری کے باوجود انگریزی فوج کے عزم مقابلہ کو توڑا نہ جاسکا۔

انگریزوں کی حوالگی

بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد نانا راؤ نے عظیم اللہ خاں اور بعض دوسرے مشیروں سے رائے لی کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر قرار پایا کہ حسنِ تدبیر سے کام لینا چاہیے، چنانچہ فیصلہ ہوا کہ انگریزوں کو ایک خط لکھا جائے۔ جس میں تجویز پیش کی جائے کہ وہ حوالگی کے لیے تیار ہوں تو انھیں کشتیوں میں سوار کرا کے سلامت الہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔ اس تحریر پر کسی کے دستخط نہ تھے، لیکن یہ تھی عظیم اللہ خاں کے قلم سے۔ مضمون یہ تھا:

علیا حضرت ملکہ وکٹوریہ کی رعایا کے نام

جن لوگوں کو لارڈ ڈلہوزی کے افعال سے کوئی تعلق نہ تھا اور وہ ہتھیار رکھ دینے کے لیے
تیار ہوں، انھیں بہ حفاظت الہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔

یہ تحریر ایک بڑھیا انگریز عورت مسز جیکوبی[1] کے ہاتھ اندر پہنچائی گئی جو بھیس بدل کر لکھنؤ جاتی ہوئی گرفتار ہوئی تھی۔ چنانچہ اس تحریر کی بناء پر جنرل وھیلر نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے حوالگی کی گفت وشنید شروع کی۔ نانا راؤ کی طرف سے عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد بھیجے گئے۔[2]

تانتیا ٹوپے نے گرفتاری کے بعد اپنے جو حالات لکھے تھے، ان میں مرقوم ہے وھیلر نے بالآخر صلح کا جھنڈا بلند کیا اور لڑائی بند ہو چکی تھی۔ اس کے بعد نانا راؤ نے ایک عورت کے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ سپاہی میرا کہنا ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ کشتیاں فراہم کر دوں، پھر وھیلر اور اس کے ساتھیوں کو الہ آباد بھیج دوں[3]۔ یہ عین قرینِ قیاس ہے اور جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں صحیح یہی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً مجاہدین کے دل میں جوش حد سے بڑھ چکا تھا، انھیں انگریزوں سے حد درجہ کاوش تھی اور ان کے ساتھی بھی انگریزوں کے ہاتھوں گوناگوں تکلیفیں اٹھا چکے تھے۔ بہت سے مارے بھی جا چکے تھے، اس لیے وہ انگریزوں کی حفاظت کے سلسلے میں افسروں یا کارفرماؤں کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دہلی میں بھی ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے۔

شرائطِ حوالگی

بہرحال عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد نے حوالگی کی شرطیں طے کیں، جن کا مفاد یہ تھا:

---

[1] Jacoby۔ اس بڑھیا کے متعلق انگریز مصنفوں میں اختلاف ہے بعض اس کا نام مسز گرین وے بتاتے ہیں، لیکن زیادہ مستند وہی ہے جو متن میں درج ہوا۔ [2] تمام انگریزوں کا یہی بیان ہے۔

۱- جائے قیام، خزانہ اور توپ خانہ حوالے کر دیا جائے گا۔

۲- ہر انگریز کو بندوق اور ساٹھ ساٹھ گولیاں ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی۔

۳- عورتوں، بچوں اور زخمیوں کے لیے گاڑیاں مہیا کر دی جائیں گی۔

۴- کشتیاں گھاٹ پر تیار رہیں گی اور ان میں آٹا بھی ضرورت کے مطابق موجود ہوگا۔

ناناکے وکیلوں میں سے ایک نے، جو غالباً عظیم اللہ خاں تھا، یہ بھی کہا کہ ہم آٹے کے علاوہ بھیڑ بکریوں کا انتظام بھی کر دیں گے[۱]۔

پہلے یہ طے ہوا تھا کہ انگریز فوراً اُٹھیں اور کشتیوں پر سوار ہو کر چلے جائیں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ صبح کے وقت روانگی عمل میں آئے۔ اس بارے میں گفت و شنید ایک انگریز مسٹر ٹاڈ نے کی تھی جو بٹھور میں انگریزی زبان کا اُستاد رہ چکا تھا۔ نانا نے اس سے کہا کہ ہم کشتیوں میں کھانے کا انتظام کر دیں گے۔ اطمینان سے دن وہاں گزارا جائے اور شام ہو جائے تو روانگی عمل میں آئے۔

دردناک واقعہ

بعد کا واقعہ یقیناً بڑا دردناک ہے، خواہ اس کی تفصیلات درست ہوں جو انگریزوں نے بیان کی ہیں یا وُہ درست ہوں جو ایک ذمّہ دار ملکی کے قلم سے نکلی ہیں۔ جب سب لوگ ستی چوڑا کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو گئے تو ہر طرف سے ان پر گولیاں چلنے لگیں۔ بہت سے مارے گئے یا دریا میں ڈوب گئے۔ کچھ گرفتار ہو گئے تھوڑے سے بچ نکلے، جن کے مفصّل حالات ۱۸۵۷ء کی تاریخ سے متعلّق ہیں۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ اس بارے میں عظیم اللہ خاں، نانا راؤ اور دوسرے لوگوں نے پہلے سے سب کچھ طے کر لیا تھا اور یہ کام تانتیا ٹوپے کے حوالے کیا گیا تھا، لیکن خود تانتیا ٹوپے نے لکھا ہے:

> اگلے روز (۲۷ جون) میں نے چالیس کشتیاں تیار کرائیں تمام مردوں، عورتوں اور بچّوں کو اُن میں سوار کرایا اور الٰہ آباد روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں پوری فوج جس میں توپ خانہ بھی شامل تھا۔ تیار ہو کر گنگا کے کنارے پہنچ گئی۔ سپاہی دریا میں کُود پڑے۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل شروع کر دیا اور کشتیوں کو آگ لگا دی[۲]۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہی درست معلوم ہوتا ہے، ورنہ ان تھوڑے انگریزوں کو یوں قتل کر کے نانا یا

---

[۱] یہ شرطیں ہر کتاب میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کان پور صہ ۱۶۸۔ [۲] میلی سن جلد پنجم صہ ۳۰۶۔

کسی دوسرے کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ تاہم اعتراف کرنا چاہیے کہ کوئی بھی شخص اس فعل کی اخلاقی ذمہ داری سے بری نہیں سمجھا جا سکتا اگرچہ وہ کتنا ہی بے بس تھا۔ جو لوگ بڑے کاموں کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ وہ اسے صحیح اصول پر پورا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انسانی جانیں لینے کی اجازت اسی صورت میں ہے کہ امن و آزادی کی خاطر ان کا لینا ناگزیر ہو جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو حوالے کر چکے اور پناہ میں آ گئے۔ ان پر یوں حملے کسی بھی مذہب اور کسی بھی ضابطۂ اخلاق کے رو سے جائز نہیں۔

ایک اور بیان

مفتی انتظام اللہ خاں فرماتے ہیں کہ عہد بالا راؤ نے توڑا۔ اسی نے کشتیوں پر گولیاں چلوائیں اور وہی قتل کا ذمہ دار ہے:

> اس واقعہ سے تانتیا ٹوپے اور عظیم اللہ خاں اور مینا (دختر نانا راؤ) نانا راؤ سے کبیدہ خاطر ہو گئے، عظیم اللہ خاں کا نام پھر نانا راؤ کے ساتھ تاریخ میں نہیں آتا۔[1]

تانتیا ٹوپے کا بیان اُوپر نقل ہو چکا ہے۔ مینا بائی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ نظر بظاہر عظیم اللہ خاں ایسے کسی فعل کا روادار نہ ہو سکتا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں عظیم اللہ خاں کا نام کہیں نہیں آیا۔

بعد کے حالات

کچھ معلوم نہیں۔ عظیم اللہ خاں کہاں کہاں رہا۔ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لکھنؤ پہنچ گیا تھا اور احمد اللہ شاہ کے ساتھ رہا۔ شاہ جہان پور سے نانا کے ساتھ نیپال چلا گیا اور وہیں ۱۸۵۹ء میں فوت ہوا۔[2] مجھے ان واقعات کی توثیق کا موقع نہ مل سکا۔ بہر حال وُہ بڑا ہی نادر انسان تھا۔

---

[1] غدر کے چند علماء صہ۱۱۱۔ [2] ایضاً ایضاً۔

سیّد احمد اللہ شاہ مدراسی

شخصیت

سید احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں اس حیثیت سے بھی ممتاز ترین شخص ہیں کہ انگریزوں نے سخت مخالفت کے باوجود ان کی بے حد ستائش کی ہے، جیساکہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے کہ باقی ممتاز مجاہدین میں سے بعض کے محرکاتِ عمل ذاتی شکایتوں یا ناکامیوں کا نتیجہ تھے لیکن احمد اللہ شاہ کے لیے انگریزوں سے ذاتی ناراضگی کا کوئی بھی سبب موجود نہ تھا۔ نہ ان کی ریاست ضبط ہوئی تھی، نہ پنشن بند ہوئی تھی، نہ اعزاز چھنا تھا۔ انھوں نے راہِ آزادی میں جو تکلیفیں اٹھائیں، جو مصیبتیں برداشت کیں، یہاں تک کہ بالآخر جان بھی دے دی، وہ ان اغراض کے لوث سے یک قلم پاک تھیں۔ ان کا نصب العین صرف یہ تھا کہ ملک اجنبیوں کے تسلط سے پاک ہو جائے۔

خاندان

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قطب شاہی سلطنت کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کی اولاد میں سے تھے جسے عالمگیر اعظم نے فتح گولکنڈہ کے بعد دولت آباد میں نظر بند کر دیا تھا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ اس کے اخلاف بعد ازاں مدراس میں منتقل ہو گئے تھے۔ قطعیت کے ساتھ بتانا مشکل ہے کہ تانا شاہ اور احمد اللہ شاہ میں کتنی پشتوں کا فصل تھا۔ بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ احمد اللہ شاہ کے والد کا نام محمد علی تھا اور دادا کا جلال الدین عادل۔ یہی جلال الدین تانا شاہ کا فرزند تھا۔ میرا خیال ہے کہ بیچ میں کم از کم دو پشتیں اور ہونی چاہئیں۔ چونکہ یہ خاندان مدراس میں مقیم ہو گیا تھا، جسے پرانے زمانے میں چیناپٹن، اور مندراج بھی کہتے تھے، اس لیے مختلف سوانح نگاروں نے احمد اللہ شاہ کو مدراسی یا مندراجی لکھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ جلال الدین عادل اپنے عہد کے قطب تھے اور ان کے صاحبزادے محمد علی (والد احمد اللہ شاہ) ٹیپو سلطان شہید اور نواب مدراس کے مصاحب رہ چکے تھے۔ [1]

نام اور لقب

احمد اللہ شاہ کا خاندانی نام "احمد علی" تھا۔ ۱۲۰۴ھ کے آس پاس تاریخ پیدائش بتائی جاتی ہے۔ میر قربان علی بجے پوری نے جو وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے، احمد علی نام

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۵۱

بدل کر احمد اللہ رکھ دیا۔ اسی نام سے شہرت پائی۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ لکھنؤ والوں نے ان کا نام "ڈنکا شاہ" رکھ دیا تھا، اس لیے کہ جب باہر نکلتے تو ان کے آگے ڈنکا بجتا جاتا۔ قیصر التواریخ میں "نقارہ شاہ" نام بھی مذکور ہے۔[1] مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ قیام آگرہ کے زمانے میں جمعرات اور جمعہ کے دن احمد اللہ شاہ کا جلوس نکلا کرتا تھا۔ وہ پالکی میں سوار ہوتے اور آگے آگے ڈنکا بجتا جاتا۔ اس وجہ سے "ڈنکا شاہ" مشہور ہو گئے تھے۔ گویا یہ نام لکھنؤ میں نہ رکھا گیا بلکہ پہلے سے رواج پا چکا تھا۔

انگریزی کتابوں میں انھیں عموماً "فیض آباد کا مولوی" بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی مجاہدانہ زندگی کا عملی آغاز فیض آباد ہی میں ہوا۔ میلی سن نے ان کے اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی کے حالات خلط ملط بھی کر دیے، اس لیے کہ دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

ابتدائی حالات

کہا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت امیرانہ طریق پر ہوئی، اس لیے کہ زہد و فقر کے ذوق کے باوجود خاندان کی عام حیثیت امیرانہ ہی تھی۔ شہسواری کے علاوہ سپہ گری کے فنون بھی سکھائے گئے۔ ان کے حالات مولانا فتح محمد تائب لکھنوی نے ایک مثنوی کی صورت میں نظم کر دیے تھے، جس کا نام "سوانح احمدی" رکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے:

جو مکتب سے ان کو فراغت ملی
بڑھا سوئے شمشیر شوق دلی

گویا پہلے انھوں نے وقت کے رواج کے مطابق تعلیم پوری کی، اس کے بعد فنون جنگ سیکھے۔

طبیعت میں تغیر

ہوش سنبھالا تو ٹیپو سلطان کی شہادت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ سلطنت خداداد تباہ ہو چکی تھی، جو دکن میں اپنی نوعیت کی یگانہ سلطنت تھی اور جو آزادی وطن کی تمام امیدوں کا آخری سہارا تھی۔ اس تباہی کو دیکھنے والے سیکڑوں افراد موجود ہوں گے اور خود احمد اللہ شاہ کا خاندان بھی اس تباہی کی وجہ سے خاصا متاثر ہوا ہوگا۔ ایک حساس طبیعت کے لیے یہ واقعات بڑے عبرت افزا ہوں گے۔ احمد اللہ شاہ کی طبیعت بے حد حساس تھی۔ انھیں سیکڑوں آدمیوں نے سنایا ہوگا کہ آزادی وطن کے علمدار ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے درمیان یہ ٹکر کس درجہ دلولہ افروز اور حمیت پرور تھی اور اس کا نتیجہ کتنا

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ٢٠٣ + [2] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ٢٤

دردناک ہوا۔ احمد اللہ شاہ پر ان واقعات کا اثر یہ ہوا کہ امارت کی زندگی سے دل متنفر ہو گیا۔ نہ وطن میں رہنا خوش گوار نظر آیا اور نہ اس ماحول کے ساتھ کسی قسم کی دل بستگی باقی رہی۔ تائب فرماتے ہیں:

بڑھا جب قدم سولھویں سال سے　　چھٹا سلسلہ ملک سے مال سے
گدا ہو گئے سیم و زر چھٹ گیا　　ملا دشتِ غربت جو گھر چھٹ گیا

حیدر آباد میں قیام

چنانچہ آپ نے گھر بار چھوڑا اور باہر نکل پڑے۔ چونکہ امارت سے انقطاع کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا خیال ہوگا کہ کہیں سے روحانی فیض حاصل کریں یا کسی مقام پر مسلمانوں کی خدمت انجام دینے کا موقع نظر آئے، تو اس سے سعادت اندوز ہوں۔

مدراس سے حیدر آباد پہنچے۔ وہاں اس زمانے میں مرہٹوں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ احمد اللہ شاہ نے بھی حیدر آباد کی طرف سے ان لڑائیوں میں حصہ لیا اور مردانگی کے جوہر خوب دکھائے۔ وہیں نکاح کر لیا۔ گویا از سرِ نو گھر بار بنا لیا۔ کچھ مدت بعد اہلیہ فوت ہو گئی۔ اس حادثۂ الیمہ نے احمد اللہ شاہ کے دل میں اطمینان و دلجمعی کی وہ تمام آرزوئیں افسردہ کر ڈالیں، جو وطن سے کنارہ کشی کے بعد قیام حیدر آباد کے زمانے میں پیدا ہوئی تھیں چنانچہ آپ نے طویل سیر و سیاحت کا فیصلہ کر لیا۔

ولایت کی سیر

تائب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے خود انگریزوں نے شاہ صاحب کو ایک عالی قدر اور بلند ہمت شہزادہ دیکھ کر مناسب سمجھا تھا کہ انھیں لنڈن کی سیر کرائی جائے:

کہ یک چند شہزادۂ خوش سیر　　کریں ملک لنڈن میں سیر و سفر
امیرانِ لنڈن سے آگاہ ہوں　　چراغِ سرِ محفلِ شاہ ہوں
یہاں کے بھی دیکھیں سب رنگ ڈھنگ　　منور کریں چشم اہلِ فرنگ
سفر کیلیے ان کو رخصت ملی　　پئے سیرِ لنڈن اجازت ملی
ہوئے آپ خرم اس ارشاد سے　　روانہ ہوئے حیدر آباد سے
خردمند انگریز ہمراہ تھا　　خبر گیرِ حالِ بن شاہ تھا
ہوئی برطرف کاوشِ رنجِ راہ　　کیا شہرِ لنڈن کو آرام گاہ
گئے شاہ لنڈن کے دربار میں　　ہوئی عزت و جاہ سرکار میں

اگر یہ درست ہے کہ یہ سفر انگریزوں کی تجویز کے مطابق ہوا تھا اور ایک دانشمند انگریز ہمراہ بھی گیا

تھا تو سمجھنا چاہیے کہ سارا خرچ بھی حکومت ہی نے برداشت کیا ہوگا۔ لیکن اس کی کوئی وجہ ذہن میں نہیں آتی۔ انگریزوں کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کسی کو قابل اور خاندانی دیکھیں تو خواہ مخواہ اپنے ملک کی سیر کرائیں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حیدرآباد کے امراء میں سے کسی نے انگریز ریزیڈنٹ کو اس امر پر راغب کیا ہو یا خود شاہ صاحب کے پاس اتنی دولت ہو کہ اپنا اور ایک انگریز رفیق کا سفر خرچ برداشت کر لیں۔ غرض لندن کا سفر ضرور کیا۔ اس کا ذریعہ خواہ کچھ ہو۔

حج و زیارت لندن کے علاوہ یورپ کے بعض حصوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ مراجعت کے وقت فیصلہ کر لیا کہ حج و زیارت کا شرف بھی حاصل کر لیا جائے۔ چنانچہ پہلے مکہ معظمہ پہنچے:

ہوئے گام فرسائے راہ حرم — زمیں جس کی ہے آسمان ارم
فراغت ملی کوشش راہ سے — مشرف ہوئے کعبۃ اللہ سے
قدم مقصد راستاں پر رکھا — سر عجز اس آستاں پر رکھا

پھر مدینہ منورہ گئے اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس میں حاضری سے شرف یاب ہوئے:

ہُوا دل کو ذوق سفر پھر قبول — لئے اقتباس حضور رسولؐ
چلے سر کے بل جان نثار نبیؐ — ہوئے خاک بوس مزار نبیؐ

وہاں سے غالباً خشکی کے راستے واپس آئے۔ اغلب ہے عراق میں زیارتیں کی ہوں۔ ایران کا ذکر بالتصریح موجود ہے:

سفر کرکے آباد و ویراں میں وہ — فروکش ہوئے ملک ایراں میں وہ
نہ پروا تھی کچھ حشمت و جاہ کی — طلب تھی فقط اپنے اللہ کی

گوشہ نشینی اور چلہ کشی واپس آئے تو خلوت و انزوا کا ذوق بہت غالب تھا۔ سفر کرتے کرتے آپ کو بیکانیر اور سانبھر کے علاقے کی فضا بہت پسند آئی۔ ملک کا بڑا حصہ ریگزار، آبادی کم، عام راستوں سے ہٹے ہوئے مقامات، نہ یہ اندیشہ کہ لوگ شوق ملاقات میں ہجوم کرکے آئیں گے اور مشاغل عبادت میں خلل پیدا ہوگا نہ یہ خیال کہ تقدس کی شہرت پھیلے گی تو انزوا کا سلسلہ باقی نہ رہ سکے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں آپ نے مسلسل چلہ کشی کی۔ چلہ کشی کا عام طریقہ یہ تھا کہ خاص اوراد و وظائف

خاص پابندیوں کے ساتھ ایک مدت تک پورے کیے جاتے تھے۔ بعض مسلمان درویش غالباً ہندو جوگیوں کی پیروی میں گوشت وغیرہ بھی ترک کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے گوشت وغیرہ کے ترک کی پابندی سے بارہ سال چلہ کشی جاری رکھی۔ گویا اتنی لمبی مدت بیکانیر اور سانبھر ہی میں گزار دی۔ پھر جے پور جا کر میر قربان علی سے فیوض حاصل کیے۔ انھوں نے رائے دی کہ ٹونک جانا چاہیے، جہاں اس زمانے میں نواب وزیر الدولہ حکمران تھے۔

سفر ٹونک

نواب وزیر الدولہ ۱۸۳۴ء میں مسند نشین ہوئے۔ لہٰذا احمد اللہ شاہ کے ٹونک جانے کا واقعہ اس سے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ نواب موصوف نے شاہ صاحب کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا۔ ٹونک میں وہ زمانہ شریعت کی پابندی کے لحاظ سے بڑا ہی بابرکت تھا۔ احمد اللہ شاہ کے ہاں بعد نماز عصر محفل سماع منعقد ہوتی تھی۔ یہ امر لوگوں کے نزدیک وجہ اعتراض بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے "عارفانہ جوابات" دیے، جن کی تفصیل کچھ نہیں بتائی گئی۔ لوگ ان جوابات پر مطمئن ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، لیکن شاہ صاحب کے لیے ٹونک میں اطمینان و دلجمعی سے قیام پذیر رہنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سنا کہ گوالیار میں محراب شاہ قلندر نامی ایک بزرگ مقیم ہیں، ان سے ملاقات کے شوق میں گوالیار چلے گئے۔

محراب شاہ سے ملاقات

تفصیلاً پتہ نہ چلا کہ محراب شاہ کون بزرگ تھے۔ انھوں نے کس وجہ سے اتنی شہرت پائی کہ احمد اللہ شاہ کو ٹونک میں ان کا نام سن کر گوالیار پہنچنے کی کشش ہوئی۔ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ محراب شاہ گوالیار کے کسی رئیس کے ہاں پیادوں میں ملازم تھے۔ یہی بزرگ ہیں جنھوں نے احمد اللہ شاہ کو جہاد آزادی کی راہ پر لگایا اور انھیں اس مقام پر پہنچایا جہاں وہ غیر فانی ناموری حاصل کرنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ کو دیکھتے ہی محراب شاہ نے فرمایا: میاں، میں تو مدت سے تمھارا منتظر تھا۔ جو وراثت بزرگوں سے مجھے ملی اُسے تمھارے حوالے کر دینے کا وقت آگیا۔ ساتھ ہی فرمایا:

> بیعت کرنی ہو تو یہ سمجھ لو کہ جان کی بازی لگانی ہوگی۔ سودا بڑا کٹھن ہے۔

احمد اللہ شاہ نے جواب میں عرض کیا کہ میں ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ تن حاضر ہوں۔ محراب شاہ نے گلے

سے لگالیا۔ خلعت خلافت بھی عطا کیا اور اوراد و وظائف کے ساتھ تلقین جہاد بھی ضروری قرار دی[1]۔

اب احمد اللہ شاہ کی زندگی ہی بدل گئی۔ وہ پہلے خلوت دانزوا کی طرف مائل تھے۔ اب جہاں جاتے، جہاد کی تلقین کرتے۔ اسی مقصد کے لیے وعظ فرماتے، اسی مقصد کے لیے دورے کرتے، یہی مقصد ان کا خاص نصب العین بن گیا۔

گوالیار سے دہلی مرشد طریقت سے اجازت لی تو یہ خیال آیا کہ ملکی حکومت کے سب سے بڑے مرکز یعنی دہلی جاکر پیش نظر مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ دہلی اس زمانے میں علماء، صوفیہ اور اکابر تدریس کا سب سے بڑا مامن تھا۔ وہاں پہنچے۔ ایک ایک بزرگ سے ملے۔ بادشاہ، امراء، درباریوں اور عوام سب سے تعلقات پیدا کیے۔ سب کو اپنا پیغام پہنچایا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا لیکن ایک مفتی صدرالدین آزردہ کے سوا کسی کے دل میں آمادگی کا جذبہ نظر نہ آیا۔ مفتی صاحب نے بھی غور و فکر کے بعد یہ رائے دی کہ دہلی کے بجائے آگرہ جاکر اصلاحی تحریک کے لیے تنظیم کا سروسامان کرنا چاہیے۔ مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار کے نام ایک تعارفی خط بھی دے دیا جو آگرہ میں مقیم تھے۔

آگرہ میں تنظیمات دہلی سے آگرہ پہنچے تو مفتی انعام اللہ خاں کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔ مفتی صاحب خود بہت ذی اثر اور علم و فضل میں درجہ امتیاز پر فائز تھے۔ اُن کا مکان وقت کے اہل علم و فضل کا مرجع تھا۔ سب وہیں جمع ہوتے تھے مثلاً مولانا قاسم دانا پوری، مولانا غلام امام شہید، مولوی امام بخش وکیل، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، شیخ محمد شفیع اللہ آبادی، مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین حسن، مولوی محمد باسط علی، مولوی معین الدین، مولوی شیخ اعتقاد علی وکیل، میرزا اسد علی بیگ وکیل، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مفتی عبدالوہاب گوپاموی، مفتی نوراللہ گوپاموی، مولوی نورالحسن، سید رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیرآبادی (والد ریاض مرحوم)۔ یہ سب احمد اللہ شاہ کے مخلص معتقد بن گئے۔ مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں جیسے لوگ پروانوں کی طرح آپ پر نثار ہونے لگے[2]۔

قیام آگرہ کے زمانے میں شاہ صاحب وعظ بھی فرماتے۔ محفل سماع بھی منعقد ہوتی۔ دیہات کے بھی

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۹۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۴۔

دورے کیے جاتے۔ ہر تیسرے دن قلعہ آگرہ کے میدان میں مُریدوں کے ساتھ تیر و تفنگ کی مشق بھی کی جاتی۔ جمعرات اور جمعہ کو جلوس نکلتے۔ خود پالکی پر سوار ہوتے اور آگے آگے ڈنکا بجتا جاتا۔[۱]

وعظوں کی کیفیت وعظوں کا نقشہ مولوی سیّد طفیل احمد صاحب علیگ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

> ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا۔ ان کی ہردلعزیزی کی یہ حالت تھی کہ پولیس نے ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم پر انھیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔[۲]

مطلب یہ کہ گرفتار کرتے تو اندیشہ تھا کہ عام لوگوں میں جوش پیدا ہو جائے گا اور پولیس اس جوش کو روک نہ سکے گی۔

واضح رہے کہ یہ ۱۸۴۹ء کے آس پاس کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں لوگ کسی کا وعظ سُننے کے لیے عموماً بڑی تعداد میں جمع ہونے کے عادی نہ تھے۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کا جمع ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وعظ یا تقریریں سب کے لیے یکساں جاذب وگیرا ہوتی تھیں۔

پہلی ابتلا ہر دلعزیزی کے پھولوں کے ساتھ رقابت وحسد کے کانٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کو بھی ان کانٹوں سے سابقہ پڑا۔ وہاں اس زمانے میں ایک پیر رہتے تھے جن کا نام فرخ شاہ تھا اور وہ فرخ آباد کے باشندے تھے۔ احمد اللہ شاہ سے پیشتر عام لوگ فرخ شاہ ہی کے پاس جاتے تھے۔ جب ان کی مجلسوں میں رونق گھٹنے لگی اور رجوع عام احمد اللہ شاہ کی طرف ہُوا، تو دنیادار پیر کی طرح فرخ شاہ کو بڑا غصہ آیا چنانچہ اُس نے ایک مدرس کو ساتھ ملا کر شاہ صاحب کے خلاف شکایتیں کیں اور ان میں اسی بات پر خاص زور دیا کہ وہ انگریزوں کے مخالف ہیں۔

تائب کا بیان ہے کہ انگریز حاکم نے شاہ صاحب کو بُلایا اور درشت طریق گفتگو اختیار کیا۔ آپ نے اس پر ایک ایسی نگاہ ڈالی کہ اس کی کیفیت ہی بدل گئی۔ چنانچہ وہ بولا:

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۲۴۔ [۲] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۸۰۔

خوشی سے جہاں چاہیے، جائیے　　سزا پائیں مفسد جو فرمائیے
کہا آپ نے تم سے مطلب نہیں　　کہ اللہ ہے احکم الحاکمیں

یعنی انگریز حاکم شاہ صاحب کو سزا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ ہر پرسش سے آزاد ہیں، البتہ جن لوگوں نے آپ کی شکایت کی اور یہ فتنہ اٹھایا، انھیں آپ کی خواہش کے مطابق سزا دی جائے گی۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کے ذریعے سے کسی کو سزا دلوانا نہیں چاہتا۔ خدا حاکموں کا حاکم ہے، وہ جو چاہے گا، ہو رہے گا۔ میرا مقدمہ اسی کی بارگاہ میں پیش ہے۔

شاہ صاحب تو بچ گئے لیکن ان کے نیاز مندوں یا دوستانہ تعلق رکھنے والوں میں سے بعض کے خلاف حاکموں نے بعد میں مقدمہ چلوایا اور انھیں قید کی سزائیں دیں۔ مفتی انعام اللہ خاں کو معطل کیا گیا۔ وہ بحال ہوئے تو انگریزوں کی ملازمت چھوڑ دی اور ریاست ٹونک میں جا کر مہتمم بندوبست ہو گئے۔ وہاں سے بھی احمد اللہ شاہ کو ہر ممکن امداد دیتے رہے۔

آگرہ سے فیض آباد

یہ بتانا مشکل ہے کہ شاہ صاحب کب آگرہ سے اودھ گئے۔ مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ مولوی سید امیر علی امیٹھوی کے شہید ہونے کی خبر ملی، تو فرمایا کہ اب کام کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ پہلے آپ گوالیار گئے اور محراب شاہ قلندر سے اجازت لے کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے[1]۔ قیصر التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے کئی سال پیشتر بمقام لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہتے تھے[2]۔ ثاقب فرماتے ہیں۔

ہوئے شاد[3] حضرت کے انعام سے　　رہے تھوڑے دن عیش و آرام سے
سفر کی وہاں سے بھی رخصت ملی　　پئے جنگ و پیکار اجازت ملی
جھکے کوشش و جستجو کی طرف　　گئے بلدۂ لکھنؤ کی طرف

---

[1] السیٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، صفحہ ۳۳۔ مولوی سید امیر علی ہنومان گڑھی فیض آباد کو ہندوؤں کے قبضے سے چھڑانے میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ اودھ کی حکومت نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا۔ انگریز افسر خرچ نے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ یہ، نومبر ۱۸۵۵ء کا واقعہ ہے۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔ [3] محراب شاہ قلندر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و پیکار کی اجازت اسی مقصد کے لیے ملی تھی جس مقصد کے لیے مولوی سید امیر علی شہید ہوئے تھے۔

سفر لکھنؤ لکھنؤ کا سفر اختیار کیا تو مریدین کی ایک جماعت بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ آپ کان پور میں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے اور کچھ مدت وہاں ٹھہرے رہے۔

۲۔ کان پور سے اناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ گئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔

۳۔ اس زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ ہی میں سرکاری ملازم تھے۔ انھوں نے بھی شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ خدا جانے شاہ صاحب نے کیا کہا کہ مولانا لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر الور چلے گئے۔

تائبؔ نے لکھا:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا
ہر اک شخص سے اس کا اظہار تھا

گویا اپنی دعوت خاص کی باتیں چھپ چھپا کر نہ کرتے تھے بلکہ علی الاعلان سب کو اصل مقصد کے لیے منظم ہو جانے پر آمادہ کرتے تھے۔

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ مولوی سیّد امیر علی کے واقعے کو تشویق جہاد کے سلسلے میں پیش کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فیض آباد میں سیّد امیر علی کے نصب العین ہی کو پایۂ تکمیل پر پہنچانا منظور ہو، چونکہ مولوی صاحب کی شہادت کا اصل ذمہ دار انگریز کپتان تھا، اس لیے شاہ صاحب کا خیال ہو کہ جو کچھ کیا وہ انگریزوں نے کیا اور انھیں ختم کیے بغیر اہل ملک کا کوئی بھی حق قائم نہیں ہو سکتا۔

فیض آباد میں سرگرمیاں لکھنؤ سے شاہ صاحب فیض آباد گئے اور وہاں کے مسلمانوں کو جانبازی و فداکاری پر آمادہ کرنے کے لیے وعظ فرمانے لگے۔ بلکہ باضابطہ جنگی تربیت اور قواعد بھی ہونے لگی۔ وہاں کے حاکم نے یہ صورت حال دیکھی تو اس کے دل میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس نے احتیاطاً ایک پلٹن منگوالی کہ مبادا فساد ہو جائے۔ شاہ صاحب کو دھمکیاں بھی دیں۔ وہ دھمکیوں سے کیا متاثر ہو سکتے تھے۔ آخر لڑائی ہوئی۔ ایک افسر زخم کھا کر گر پڑا۔ خود شاہ صاحب بھی زخمی ہو گئے۔ بے ہوشی کی حالت میں انھیں گرفتار کر کے جیل خانے پہنچا دیا گیا۔[۱]

"قیصر التواریخ" میں یہ واقعہ یوں مرقوم ہے:

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۳۰-۲۷۔

احمد اللہ شاہ فقیر، رہنے والا مندراج یا دکن کا کئی برس سے
لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہا کرتا تھا، مشہور بہ "نقارہ شاہ" اتفاقاً
کسی ارادے سے فیض آباد گیا۔ سرائے میں اُترا تھا۔ کسی برقنداز سے
فساد کیا تھا۔ قید ہو کر بول کی پلٹن میں تھا۔[1]

میلی سن کا بیان میلی سن نے یہ حالات دوسرے ہی انداز میں بیان کیے ہیں اور جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، یہی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً میلی سن نے جو کچھ لکھا ہوگا، وہ انگریزی حکومت کی تحقیقات کاملہ کے نتائج سامنے رکھ کر لکھا ہوگا۔ وہ احمد اللہ شاہ کے متعلق لکھتا ہے:

> یہ امر یقینی ہے کہ اس نے اپریل ۱۸۵۷ء میں باغیانہ اشتہارات پورے اودھ میں شائع کیے تھے۔ پولیس نے اسے بدیں وجہ گرفتار نہ کیا کہ اس کام کے لیے فوج درکار تھی۔ پھر اس پر مقدمہ چلا اور موت کی سزا سنائی گئی۔ اس سزا کے نفاذ سے پیشتر اودھ میں بغاوت شروع ہو گئی اور یورپ کے بہت سے سیاسی مجرموں کی طرح وہ (احمد اللہ شاہ) قید خانے کے صحن سے بہ یک جست تخت کے پائے تک پہنچ گیا اور لکھنؤ کی بیگم (حضرت محل) کا راز دار دوست اور مشیر نیز باغیوں کا معتمد علیہ قائد بن گیا۔[2]

دوسری جگہ لکھتا ہے:

> الحاقِ اودھ کے بعد اس نے (احمد اللہ شاہ) شمالی و غربی صوبے کا دورہ ایک ایسے مقصد کے لیے کیا جو فرنگیوں کے نزدیک سراسر پُراسرار تھا۔ اس زمانے میں اس پر سازش کا شبہ تھا۔ بعد ازاں خاصے ثبوت فراہم ہو گئے کہ الحاق اودھ اور آغاز غدر کی درمیانی مدت میں اودھ کے بعض ذی اثر آدمیوں نے ایک سازش کی تھی۔ بلاشبہ مولوی

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔ [2] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۷۹۔

(احمد اللہ شاہ) اس سازش کا لیڈر تھا۔ سازش کی شاخیں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ آگرہ یقیناً اس سازش کا ایک مرکز تھا، جہاں مولوی کچھ دیر قیام پذیر رہا۔ قریباً یقینی طور پر دہلی میں، نیز میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ میں اس کی شاخیں تھیں۔ موخر الذکر مقام میں شاہ اودھ اور اس کے بہت سے لواحق ٹھہرے ہوئے تھے[1]

ان اقتباسات سے پیٹرز کے تمام بیانات کی فی الجملہ تصدیق ہوتی ہے یعنی یہ کہ احمد اللہ شاہ نے سازش کا جو جال پھیلایا تھا، آگرہ اور دہلی یقینی طور پر اس کے خاص مرکز تھے۔ بنیادی فرق صرف یہ ہے کہ سابقہ بیانات کے مطابق احمد اللہ شاہ ایک کشمکش کے باعث اسیر ہوئے، میلی سن کہتا ہے کہ سازش کے ماتحت ان پر مقدمہ چلا اور الزامات اتنے سنگین تھے کہ موت کی سزا سنائی گئی۔

ایک اور انگریزی روایت

۱۸۵۷ء کے متعلق جن انگریزوں نے کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک ہومز بھی ہے، جس کی کتاب اختصار و جامعیت کے لحاظ سے بہت اچھی مانی جاتی ہے، وہ احمد اللہ شاہ کے متعلق لکھتا ہے:

ایک مولوی کچھ مدت سے شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ وہ کافروں کے خلاف جہاد کے وعظ کہا کرتا تھا۔ فیض آباد میں نمودار ہوا، تو اُس نے لوگوں کے دل میں فساد کا بیج بونا شروع کیا۔ اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اس وقت تک انگریزوں کو خفیف سا وہم بھی نہ تھا کہ ان کی حکومت میں تزلزل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس مولوی کی صلاحیت فتنہ انگیزی کا ٹھیک اندازہ نہ کر سکے۔ کئی ماہ بعد حقیقت منکشف ہوئی اور وہ شخص ان سازشیوں کے گروہ کا سردار ثابت ہوا جو اپنے ہم مذہبوں کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے تھے[2]

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۹۲ ✣ [2] ہومز صفحہ ۷۱ ✣

فیض آباد میں ہنگامہ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ فیض آباد میں لشکریوں نے انگریزوں کے خلاف ہنگامہ بپا کیا تو ان کا پہلا حملہ جیل خانے پر ہوا اور تمام قیدی رہا کر دیے گئے۔ میلی سن کا بیان بھی یہی ہے۔ یوں احمد اللہ شاہ نے قید فرنگ سے نجات پا کر جہاد ات کا آغاز کیا۔

> ادھر مولوی سکندر شاہ فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے عَلَم جہاد بلند کیا۔ عوام ان کے ساتھ ہو گئے۔ لفٹنٹ ٹامس صاحب نے فوج سے ان کا مقابلہ کیا۔ مولوی صاحب کے ساتھ بھی بے ضابطہ فوج تھی۔ توپ خانے کے چند گوروں نے عوام کے چھکے چھڑا دیے۔ آخرش مولوی سکندر شاہ کو پکڑ لیا اور وہ قید خانے میں داخل کر دیے گئے اور مولوی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کا رُخ کر لیا۔[1]

مجھے انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ البتہ لفٹنٹ ٹامس فیض آباد میں موجود تھا۔ جب وہاں انگریزی اقتدار کا تختہ اُلٹا تو انگریزوں کو کشتیوں میں سوار کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ ان لوگوں پر راستے میں حملے ہوتے رہے۔ لفٹنٹ ٹامس اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک ندی عبور کرتا ہوا مارا گیا۔[2] اگر احمد اللہ شاہ اسی روز قید سے رہا ہوئے جس روز فیض آباد میں انگریزوں کے خلاف عَلَم جہاد بلند کیا گیا تو اسے ۷۔ جون ۱۸۵۷ء کا واقعہ سمجھنا چاہیے۔

لڑائیاں کب شروع ہوئیں؟ اگرچہ انگریزی کتابوں میں احمد اللہ شاہ کو باغیوں اور ہمارے تصور کے مطابق مجاہدوں کا سردار مانا جاتا ہے لیکن لڑائیوں میں اس کا ذکر دسمبر ۱۸۵۷ء سے پیشتر نہیں آتا۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب فیض آباد سے ۷ یا ۸۔ جون کو نکلے اور چھ مہینے انھوں نے اِدھر اُدھر پھر کر گزار دیے۔ "قیصر التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے پھر ان کی بعض یورشوں کا ذکر بہ قید تاریخ مذکور ہے۔ مثلاً احمد اللہ شاہ فقیر:

> اپنے جذب جنوں سے الفاظ شد نی اور لفظ قتل و غارت بکا کرتا تھا۔ جب ہنگامہ ہوا سپاہ نے فقیر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ پہلے فوج نے چاہا کہ اسے اپنا افسر کریں، ہمارا سرپرست ہو لیکن اس کی باتوں سے ڈرے کہ

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۳۷-۳۸۔ [2] میلی سن جلد سوم صفحہ ۲۶۹۔

ہندو سے بہت بیزار اور نفرت رکھتا ہے۔ اکثر انتقام ہنومان گڑھی

کو بھی کہتا ہے۔ مبادا اس کی جہت سے پھر ہندو مسلمان میں صورت فساد

نکلے۔ اس جہت سے افسر نہ کیا۔[1]

بدیہی امور اس اقتباس کے الفاظ و انداز کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے مطالب کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں یوں تیار کر سکتے ہیں:

۱۔ احمد اللہ شاہ کی عام حیثیت ایک مجذوب سے چنداں مختلف نہ تھی یا سمجھ لیجیے کہ ان پر مجذوبیت کی کیفیت وقتاً فوقتاً طاری ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے کلمات بے اختیار کہتے تھے گویا زدہ گشت کا کوئی خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

۲۔ احمد اللہ شاہ اگرچہ بظاہر فقیر اور حقیقتاً اجنبی تھے، تاہم ان کے مجاہدانہ عزائم کا درجہ اہل فوج کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ انگریزی قیادت سے نجات حاصل کرنے کے بعد انھیں کو سردار اور سالار بنا لینے کے خواہاں تھے۔

۳۔ اس ارادے کو لباس عمل پہنانے میں صرف اس وجہ سے توقف ہوا کہ احمد اللہ شاہ کو ہندوؤں سے نفرت تھی۔ اہل فوج نے سوچا کہ اگر انھیں کو سردار بنا لیا گیا تو ممکن ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کی نوبت آجائے، حالانکہ وقت اور پیش نظر مقاصد زیادہ سے زیادہ اتحاد کے متقاضی تھے۔

آخری نتیجے کے سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ غالباً یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معلوم ہے کہ آگرہ میں احمد اللہ شاہ کے وعظ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں باعث کشش تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد میں شاہ صاحب تلنگوں سے مل کر لڑتے رہے۔ ان کے ساتھی رئیسوں میں بہت سے ہندو تھے اور لشکری زیادہ تر ہندو تھے بلکہ ہندو راجا کو ساتھ ملانے کی غرض سے پوائیں گئے تھے، جہاں ان کی شہادت ہوئی۔ ممکن ہے فیض آباد میں انھوں نے سید امیر علی شہید کے واقعے کو ایسے انداز میں پیش کیا ہو جس سے سمجھا گیا، انھیں ہندوؤں سے نفرت تھی یا ان کی سرداری میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کا اندیشہ تھا۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔

ابتدائی معرکے

لکھنؤ میں جہادِ آزادی کا آغاز ۳۰۔ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا یعنی واقعہ میرٹھ سے کم و بیش بیس روز بعد۔ سر ہنری لارنس اس زمانے میں اودھ کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے شروع ہی میں پیش آنے والے خطرے کی بناء پر ریزیڈنسی اور آس پاس کی مستحکم عمارتوں کو ملا کر انگریزوں کے لیے ایک حصار تیار کرا لیا تھا۔ جا بجا استحکامات بھی کر لیے تھے اور دفاعی مورچے بھی بنا لیے تھے۔

جب باہر سے خاصی دیسی فوج لکھنؤ پہنچ گئی تو ریزیڈنسی یا بیلی گارد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اب اس میں دو عمارتیں بھی تھیں جو سر ہنری لارنس نے انگریزوں کی سکونت کے لیے مخصوص کر لی تھیں۔ ۲ جولائی کو ہنری لارنس مارا گیا۔ ۵۔ جولائی کو برجیس قدر کی مسند نشینی کا اعلان ہوا۔ اس وقت سے مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ ان کے بارے میں قیصر التواریخ کے ذکر کا انداز خاصا ناخوش گوار ہے۔ تاہم اس سے واقعات کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ احمد اللہ شاہ ابتدا ہی سے جوشِ جہاد میں پیش پیش تھے اور انھوں نے متعدد حملے کیے۔ وہ ہر حملے میں مجاہدین کے ساتھ ہوتے تھے۔

۲۔ ۱۴ جولائی کا حملہ اتنا سخت تھا کہ انگریز عورتیں تہ خانے میں جا چھپیں۔ ہر ایک کی نظر میں موت پھر گئی۔ احمد اللہ شاہ بیلی گارد کے پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کیے کہ بس اس حملے میں ہی سب انگریزوں کا کام تمام ہے۔[1]

۳۔ ۲۱۔ جولائی کو دھاوا ہوا تو احمد اللہ شاہ اس شان سے چلے کہ آگے آگے نقیب بولتا ہوا اور ڈنکا بجتا ہوا جا رہا تھا۔ مورچوں میں پہنچ کر آڑ میں دھاوا کیا۔ بیلی گارد کی دیوار کے نیچے پہنچ کر اسے کھودنا شروع کر دیا۔ اندر سے بم کے گولے آئے۔ بہت سے مارے گئے۔ باقی واپس ہوئے۔[2]

تفرقے کی مصیبت

تفرقے ہی کی مصیبت نے دہلی میں مجاہدین کی قوت مضمحل کر دی تھی۔ تفرقہ ہی لکھنؤ میں مجاہدین کے لیے گوناگوں آفتوں کا باعث بنا۔ حضرت محل کا داروغہ خاص نواب محمد خاں طبیعت کا تیز اور مزاج کا سخت تھا۔ اسے غالباً یہ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کر کے فوج کا خرچ چلائے۔ چنانچہ اس نے بڑی سختی کے ساتھ لوگوں سے روپیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۰۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۳۲-۲۳۳۔

احمد اللہ شاہ کے پاس شکایتیں پیش ہوئیں تو وہ عوام کی اس پریشانی کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے منادی کرا دی کہ اب اگر کسی شخص کے گھر تحصیل کے لیے کوئی فوجی دستہ جائے تو ہمیں اطلاع دی جائے۔ ہم اپنے آدمی بھیج کر جبراً روپیہ وصول کرنے والے کو گرفتار کر لیں گے۔

ساتھ ہی شہر کے مختلف حصّوں میں پچاس آدمی مقرر کر دیے گئے کہ وہ شاہ صاحب کو بلے توقف صحیح خبریں پہنچاتے رہیں۔ ممو خاں کو اس بات پر اتنا غصّہ آیا کہ سپاہ کو حکم دے دیا شاہ صاحب کو زندہ گرفتار کر لو، یا ان کا سر کاٹ لاؤ۔ چنانچہ اس فوج نے شاہ صاحب کا محاصرہ کر لیا، جو گیارہ دن جاری رہا۔ اس اثناء میں رسد بھی نہ ملی۔ آخر سپاہیوں نے ممو خاں کا حکم پس پشت ڈال کر شاہ صاحب کو شیش محل میں پہنچا دیا۔ ممو خاں نے دھمکی دی کہ شاہ صاحب کا ساتھ دینے والے سپاہیوں کو تنخواہ نہ ملے گی۔ سپاہیوں نے نوکری چھوڑ دی اور شاہ صاحب فیض آباد جانے کے لیے تیار ہو گئے[1]۔

واضح رہے کہ یہ سب کچھ اس حالت میں ہو رہا تھا جب انگریزوں کا ایک گروہ لکھنؤ میں محصور بیٹھا تھا اور انھیں بچانے کی غرض سے فوج آنے والی تھی۔

غدّاری اور خیانت کی مثالیں

۹۔ نومبر ۱۸۵۷ء کو عالم باغ پر ایک یورش میں امجد علی خاں، احمد اللہ شاہ، اور احمد علی نے بڑی جوانمردی اور جانبازی دکھائی۔

> اس وقت تلنگوں نے کہا کہ یہاں کے کارتوسوں میں بھوسی بھری ہوتی ہے اور بدے گراب کے کرچ بھر رہے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ سب اہل کار انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں[2]۔

ممو خاں کو بھی تلنگوں نے پکڑ لیا اور معاملہ حضرت محل تک پہنچا۔ بیگم نے ممو خاں کو تو بچا لیا اور تلنگوں کو اجازت دے دی کہ جس شخص پر خیانت ثابت ہو اُسے مار ڈالو۔ چنانچہ میر محمد علی اور ایک متصدی مارے گئے جو گولے بنواتے تھے۔ صاحب قیصر التواریخ کا بیان ہے:

> اس امر میں تلنگوں کا گمان غلط نہ تھا۔ یہ کارروائی اپنی عاقبت

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۰۰-۳۰۱۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۸۲۔

اندیشی سمجھ کر کرتے تھے کہ اگر انگریزی عمل ہو جائے گا ہم اسی خیر خواہی کو
پیش کریں گے[1]

غور کیجیے کہ آزادی وطن کے مجاہدوں نے کن ناخوش گوار و ناساز گار حالات میں جان کی بازی لگائی۔ انھیں قدم قدم پر غداریوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ بایں ہمہ پیش نظر مقصد اس درجہ عزیز و محبوب تھا کہ وہ ہر قسم کی پریشانیاں صابرانہ برداشت کرتے جاتے تھے۔

تنظیم کی مہلت

ہم حضرت محل کے حالات میں لکھ چکے ہیں کہ قومی قوتوں کی تنظیم اور نظم حکومت کے استحکام کی جیسی زرّیں مہلت لکھنؤ کو ملی، کسی دوسرے شہر کو نہ ملی۔ انگریز ابتدائی دور ہی میں محصور ہو گئے تھے۔ دو مرتبہ ہیوے لاک نے ان کی کمک کے لیے قدم آگے بڑھایا، دونوں مرتبہ اسے اُسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر جنرل آوٹ رم اس کام کا مختار مقرر ہوا۔ اُس نے اور ہیوے لاک نے پیش قدمی کی اور لکھنؤ پہنچ گئے لیکن دونوں خود محصوروں میں شامل ہو گئے۔ یہ ہو چکا تو کالن کیمبل فوج لے کر آیا۔ اسے کان پور کے متعلق شدید خطرہ لگا ہوا تھا، لہٰذا عورتوں بچّوں یا زخمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ آوٹ رم اور ہیوے لاک کو ریزیڈنسی سے نکال کر عالم باغ میں چھوڑ گیا جو شہر کے جنوب میں تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہیوے لاک نے وہیں وفات پائی۔ کان پور کی طرف سے مطمئن ہو کر کالن کیمبل آیا تو مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ فتح ہوا۔

احمد اللہ شاہ نے یہ پوری مدت لکھنؤ ہی میں گزاری اور لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

آوٹ رم کی پوزیشن

آوٹ رم کو اگرچہ عالم باغ میں بٹھایا گیا تھا، لیکن اُس نے حفاظت کی مصلحتوں کے پیش نظر اپنی فوج کا ایک حصّہ باغ میں رکھا، باقی فوج کو آدھ میل پیچھے ہٹا کر کھلے میدان میں معسکر قائم کیا، جس کا میمنہ ایک قلعے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ باقی حصّوں میں غنیم کی یورشوں کے مطابق آہستہ آہستہ حفاظتی مورچے تیار کر لیے گئے۔ اس مقام میں ٹھہرنے سے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لکھنؤ اور کان پور کے درمیانی راستے کی حفاظت ٹھیک ٹھیک ہو سکتی تھی۔

مجاہدین نے جو حملے ابتدا میں کیے تھے، ان میں چونکہ زیادہ نقصان ہوا تھا، اس لیے وہ کچھ مدت تک چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ اوائل دسمبر میں ان کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اس تیزی کی روح رواں صرف

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۸۲

احمد اللہ شاہ کی ذات تھی۔

شاہ صاحب کا نقشۂ یورش

احمد اللہ شاہ نے صورت حال کی خوب دیکھ بھال کی، اس کے بعد انگریزی فوج پر یورش کا ایک ایسا نقشہ تیار کیا، جسے میلی سن نے بھی ہنرمندانہ تسلیم کیا ہے۔ اگر فوج کی خاصی تعداد کے ساتھ پوری سرگرمی سے اس نقشے پر عمل کیا جاتا تو یقیناً انگریزوں کے لیے بڑی مشکلات پیش آتیں۔

نقشہ یہ تھا کہ میمنہ کی طرف سے حملہ ہو نہ سکتا تھا لہٰذا انگریزوں کے پورے محاذ کو براہ راست جنگ میں مصروف رکھا جائے۔ پھر یکایک ان کے میسرے پر حملہ کرکے اسے منقلب کر دیا جائے۔ بعد ازاں پُل پر قابض ہو کر دونوں جانب سے قیامت کی آتشباری کی جائے یہاں تک کہ ایک بھی انگریز زندہ نہ رہے۔

اس نقشے کے مطابق دمدمے بننے شروع ہو گئے اور انھیں جہاں تک ضروری تھا پھیلا دیا گیا۔ ۲۲۔ دسمبر کو اصل نقشے کے مطابق باقاعدہ عمل شروع کیا۔ پیش بندی کے طور پر ایک فوج کو انگریزوں کے عقب میں بھیج دیا گیا تاکہ کان پور کی طرف سے اس کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ افسوس کہ دو روز پیشتر ایک جاسوس نے پورے نقشے کو تفصیلاً آوٹ رم کے پاس پہنچا دیا اور اسے دفاعی تدابیر اختیار کرنے کے لیے خاصا وقت مل گیا۔[۱] اس طرح احمد اللہ شاہ کی یہ کوشش بار آور نہ ہو سکی۔

ایک اور یورش

انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ تین ہفتے تک پھر کوئی خاص سرگرمی نہ دکھائی گئی، البتہ توپوں کی گولہ باری جاری رہی۔ اس اثنا میں آوٹ رم نے خالی گاڑیوں کا ایک قافلہ کان پور کی طرف بھیجا اور ایک فوج بھی ساتھ کر دی۔

مجاہدین نے پہلے سے منصب علی کو انگریزوں کے عقب میں متعین کر رکھا تھا۔ پھر لکھنؤ سے اسے خاصی کمک بھی مل گئی تاکہ قافلے کو روک لیا جائے، اس لیے آوٹ رم کو اپنی مختصر سی فوج میں سے ایک حصہ حفاظت کے لیے ساتھ بھیجنا پڑا تھا۔ اس طرح اس کی پوزیشن بظاہر خاصی کمزور ہو گئی۔ ۱۲۔ جنوری کو مجاہدین نے آوٹ رم پر انتہائی شدت سے حملہ کیا، لیکن انگریزی بیانات کے مطابق یہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ مولانا احمد اللہ شاہ اس یورش میں بھی پیش پیش تھے۔[۲]

قافلے پر حملے کا حلف

۱۲۔ جنوری کی یورش بے نتیجہ رہنے کے بعد احمد اللہ شاہ نے حلف اٹھایا

---

[۱] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۴۰-۲۴۱ ٭ [۲] ایضاً صفحہ ۲۴۳-۲۴۴

کہ رسد کے قافلے پر حملہ کرکے اسے لکھنؤ لایا جائے گا۔ چنانچہ ۱۴۔ جنوری کو وہ ایک فوج لے کر نکلے اور چکر کاٹ کر ایک ایسے مقام پر جم گئے جہاں سے قافلۂ رسد پر کامیاب حملہ ہو سکتا تھا۔ ان کی اس نقل و حرکت کی بھی پوری خبریں جاسوسوں نے بروقت آوٹ رم کو پہنچا دی تھیں۔ چنانچہ کھلے میدان میں لڑائی ہوئی، جس میں مولانا احمد اللہ شاہ زخمی ہوئے اور میلی سن کے بیان کے مطابق بہ مشکل گرفتاری سے بچے۔[1]

لکھنؤ کی تسخیر

اس کے بعد بھی ترکتازوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مثلاً ۱۵۔ فروری اور ۲۲۔ فروری کو بڑی سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ۲۵۔ فروری کو نہایت شدید حملہ کیا گیا۔ پھر انگریزی فوج کے پاس بھاری کمک پہنچ گئی نیپال کی فوج بھی آ گئی اور مجاہدین کے لیے کامیابی کے امکانات بہت کم رہ گئے۔ بایں ہمہ جس شخص نے آخری دم تک ہمت نہ ہاری وہ صرف احمد اللہ شاہ تھے یا شہزادہ فیروز شاہ۔ آخر انگریزوں نے لکھنؤ پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ قدم بہ قدم بڑھتے گئے۔ ۲۱۔ مارچ تک شہر مجاہدین سے خالی ہو چکا تھا۔ لیکن احمد اللہ شاہ بہ دستور وہاں بیٹھے تھے۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ ایک مستحکم عمارت میں دو توپیں نصب کر رکھی تھیں اور وہ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک جیش لگرڈ کی سرکردگی میں ان کے خلاف بھیجا گیا۔

> باغیوں نے جیسے عزم اور جیسی استقامت کا اظہار اس موقع پر کیا، اس کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ انھوں نے بڑی بہادری و جوانمردی سے مدافعت کی اور اس وقت تک باہر نہ نکالے جا سکے جب تک انھوں نے ہمارے بہت سے آدمی قتل نہ کر لیے اور ان سے بدرجہا زیادہ کو مجروح نہ کر دیا۔ جب وہ انجام کار نکالے گئے تو برگیڈیر کیمبل کا رسالہ سامنے آ گیا جس نے چھ میل تک ان کا تعاقب کیا اور خاصا نقصان پہنچایا لیکن مولوی بچ نکلا۔[3]

احمد اللہ کے کمالات

لکھنؤ سے نکلنے کے بعد احمد اللہ شاہ نے ایک خاصا بڑا لشکر باڑی میں جمع کر لیا تھا، جو لکھنؤ سے بائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہوپ گرانٹ کو حکم ملا کہ وہ باڑی جائے۔ وہاں مجاہدین کو منتشر کرے پھر محمود آباد ہوتا ہوا گھاگھرا کے ساتھ ساتھ بٹول پہنچے جہاں

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۴۵ ۔ [2] LUGARD ۔ [3] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۸۶ ۔

سے اطلاع ملی تھی کہ بیگم حضرت محل چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقیم ہے۔

ہوپ گرانٹ ۱۱- اپریل ۱۸۵۸ء کی صبح کو لکھنؤ سے روانہ ہؤا۔ وہ کوئی چھ میل کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ ٹھہرا ہؤا تھا۔ پہرے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں احمد اللہ شاہ کی فوج کے چند بہادر آئے۔ انگریزی پہریدار نے ٹوکا اور پوچھا کہ کون ہو تو انھوں نے انتہائی بے تکلفی سے جواب دیا کہ ہم ۱۲ بے قاعدہ فوج کے سپاہی ہیں۔

یقیناً وہ ۱۲ کے سپاہی تھے لیکن یہ سپاہ اپنے انگریز کمانڈر کو قتل کر کے جولائی ۱۸۵۷ء میں سرکشی اختیار کر چکی تھی۔ پہریدار کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ۱۲ کون سی پلٹن ہے۔ اُس نے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ من چلے سواروں نے انگریزی فوج کی پوری کیفیت کا جائزہ لیا اور سارے حالات معلوم کر کے اطمینان سے اپنے سردار مولانا احمد اللہ شاہ کے پاس باڑی پہنچ گئے۔ یقیناً دیدہ دلیری کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی اور سپاہیوں کو یہ تحیر خیز ہنرمندیاں احمد اللہ شاہ نے سکھائی تھیں۔

جنگِ باڑی انگریزی فوج کی پوری کیفیت معلوم کر لینے کے بعد احمد اللہ شاہ نے نقشۂ جنگ تیار کیا جو نہایت عمدہ تھا۔ وہ باڑی سے انگریزی فوج کی جانب روانہ ہوئے۔ چار میل پر ایک گاؤں ملا جس کے سامنے سے ایک ندی گزرتی تھی اور اس ندی کے کنارے بہت اونچے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی پیادہ فوج کناروں کے اندر جا بجا اس طرح بٹھادی کہ انگریزی فوج کو قریب پہنچنے تک اس کے متعلق کچھ اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ رسالے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دائیں بائیں بھیجا اور ہدایت کر دی کہ چکّر کاٹ کر انگریزی فوج کے بازوؤں اور عقب کو روک لیں۔ مقصود یہ تھا کہ رسالہ انگریزی فوج کے لیے دائیں بائیں یا پیچھے کی طرف بچ نکلنے سے روکے گا۔ سامنے سے پیادہ فوج حملہ آور ہوگی۔ اس طرح پورا لشکر تباہ کر دیا جائے گا۔

رسالے نے بڑا کمال دکھایا اور رات کی تیرگی میں کام پورا کر دیا۔ انگریزی فوج ۱۳- اپریل کی صبح کو بے فکری سے روانہ ہوئی۔ وہ تباہی کے غار میں پہنچ رہی تھی کہ رسالے والوں سے ایک خوفناک غلطی سرزد ہوئی۔ انھیں انگریزی فوج کے عقب میں دو توپیں نظر آئیں، جن کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ان احمقوں نے اصل نقشۂ جنگ کو کامیاب بنانے کے بجائے ان دو توپوں پر عجلت سے قبضہ کر لینا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز افسر صورت حال پر متنبہ ہو گئے۔ اب رسالے والوں کو خیال آیا کہ ابتدائی نقشے کو پایۂ تکمیل پر پہنچائیں، لیکن یہ ممکن نہ تھا اس لیے کہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی۔[1] چنانچہ یہ نقشہ بھی صرف رسالے والوں کی ایک اتفاقی غلطی کے باعث

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۴۷ - ۳۴۸ ۔

بے نتیجہ رہا اور احمد اللہ شاہ کو باڑی سے نکل کر شاہ جہان پور کا رُخ کرنا پڑا۔ جو اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا آخری میدان تھا۔

شاہ جہان پور

شاہ صاحب شاہ جہان پور پہنچے تو بڑے اطمینان سے وہاں بیٹھ گئے۔ نانا بھی اس وقت وہیں تھا۔ ۳۰۔اپریل کو کالن کیمبل وہاں فوج لے کر پہنچا، تو انھیں شاہ جہان پور کو خالی کر دینا مناسب معلوم ہؤا۔ نانا کی رائے یہ تھی کہ تمام سرکاری عمارتیں مسمار کر دی جائیں تاکہ انگریزوں کو کھلی جگہ میں دن بسر کرنے پڑیں۔ شاہ صاحب تخلیے پر اس لیے راضی ہوئے تھے کہ انگریز شاہ جہان پور پر قبضہ کر لینے کے بعد بریلی جائیں گے اور زیادہ بڑی قوت ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں انھیں خاصے سخت مقابلے سے سابقہ پڑے گا اور درمیانی مدت میں شاہ جہان پور پر آسانی سے دوبارہ قبضہ کیا جا سکے گا۔

چنانچہ یہی ہؤا۔ کالن کیمبل نے تھوڑی سی فوج شاہ جہان پور میں چھوڑی۔ کرنیل ہیل[1] کو اس کا انچارج بنایا اور خود بریلی چلا گیا۔

احمد اللہ کی یورش

اب مولانا احمد اللہ شاہ نے بڑی بھاری قوت سے شاہ جہان پور پر یورش کی۔ ہیل نے اپنا خیمہ درختوں کے ایک جھنڈ میں لگایا تھا۔ جیل خانے کو خوب مستحکم کر لیا تھا۔ وہاں رسد بھی جمع کر لی تھی۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ اگر سیدھا شاہ جہان پور پہنچ جاتا، تو ہیل کے لیے بڑی مشکلات پیش آتیں۔ لیکن سوء اتفاق سے شہر چار میل رہ گیا تو احمد اللہ شاہ نے فوج کو سستانے کا موقع دے دیا۔ اس اثناء میں جاسوسوں نے ہیل کو اطلاع دے دی۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے اٹھ کر جیل خانے کی عمارت میں جا بیٹھا۔ اور اسے قلعے کے طور پر استعمال کیا۔ احمد اللہ شاہ نے شہر میں پہنچ کر توپیں مناسب مقامات پر نصب کر لیں اور گولہ باری شروع کر دی۔ ۷۔مئی کو کالن کیمبل صورت حالات سے باخبر ہؤا۔ اس وقت بریلی فتح ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً ایک فوج کمک کے لیے بھیج دی۔ اس اثناء میں احمد اللہ شاہ کو بھی کمک مل چکی تھی۔ ۱۰۔مئی تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر احمد اللہ شاہ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ محمدی پہنچے۔ پھر اُسے بھی خالی کر کے اودھ میں داخل ہو گئے۔

راجا پوائیں

اب ضروری یہ تھا کہ قومی قوتوں کو از سرِ نو منظم کیا جاتا۔ اس سلسلے میں بھی تمام سرگرمیوں کا قرعہ احمد اللہ شاہ ہی کے نام پڑا۔ راجا پوائیں[2] کا علاقہ بندھیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر

---

[1] HALE ‏۔ [2] پوائیں شاہ جہان پور سے شمال مشرق میں تقریباً اٹھارہ میل پر تھا۔

واقع تھا اور راجا تعاون کے لیے تیار ہو جاتا تو تنظیم میں اک گونہ سہولت پیدا ہو سکتی تھی۔ احمد اللہ شاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ خود راجا پوائیں سے مل کر اس بارے میں بات چیت کریں گے۔ اب مختلف بیانات پیش نظر رکھ لیجیے:

۱۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ حضرت محل کے حکم کے مطابق پوائیں گئے تھے تاکہ وہاں کے راجا جگن ناتھ سنگھ[۱] کو انگریزوں کے خلاف نئی جمعیت میں شامل ہونے کی ترغیب دیں اور راجا خاصا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ شاہ صاحب نے روانگی سے پیشتر اپنا ایک قاصد بھیج دیا تھا اور راجا نے بات چیت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تھی[۲]۔

۲۔ ہومز کہتا ہے کہ راجا کے پاس چند دیسی افسر پناہ گزیں تھے جنھوں نے انگریزوں کے ہاں ملازمت کر رکھی تھی۔ احمد اللہ اس غرض سے پوائیں گئے تھے کہ افسروں کی حوالگی کا مطالبہ کریں[۳]۔

۳۔ ساورکر کا بیان ہے کہ مولانا احمد اللہ اودھ میں جو نیا طوفان بپا کرنا چاہتے تھے، اس کے سلسلے میں راجا پوائیں کی معمولی امداد بھی خاصی مؤثر ہوتی۔ چنانچہ مولانا نے حضرت محل کا مُہری پروانہ راجا کے پاس بھیج دیا۔ یہ چھوٹا سا راجا جسم کا موٹا اور بے ہنگم، حد درجہ کاہل اور سست، عقل و دانش میں فرومایہ، میدانِ جنگ کا ذکر سنتے ہی سراسیمہ ہو گیا۔ وہ جتنا بزدل تھا، اتنا ہی دغاباز تھا۔ فوراً جواب دیا کہ مولانا احمد اللہ خود مجھ سے ملیں۔ اس دعوت پر مولانا پوائیں گئے[۴]۔

شہادت

بہ ہر حال مولانا احمد اللہ شاہ ۵۔ جون کو ہاتھی پر سوار ہو کر پوائیں گئے۔ تھوڑے سے آدمی ساتھ تھے۔ پوائیں پہنچے تو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئے کہ قلعے کے دروازے بند تھے۔ فصیل پر سپاہی جابجا لڑنے کے لیے تیار تھے۔ خود راجا، اس کا بھائی اور مسلّح آدمی ان دُھسوں کے پیچھے کھڑے تھے، جو بڑے دروازے کے اوپر تھیں۔ گویا مقابلے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی:

> ان ناساز گار حالات میں بات چیت شروع ہوئی۔ مولوی کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ جب تک راجا کو خوب ہراساں زدہ نہ کیا جائے گا، نرے زورِ کلام سے کچھ نتیجہ بر آمد نہ ہوگا۔ ہراس پیدا کرنے کی غرض سے اُس نے اپنے فیل بان سے کہا کہ ہاتھی کو آگے بڑھاؤ اور دروازہ توڑ ڈالو۔

---

[۱] راجا کا صحیح نام یہی ہے۔ نہ کہ بلدیو سنگھ جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے۔ بلدیو سنگھ راجا کے بھائی کا نام تھا۔

[۲] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۸۔ [۳] ہومز صفحہ 512۔ [۴] ساورکر صفحہ ۳۶۹۔

ہاتھی آگے بڑھا اور اُس نے اس زور سے ٹکر ماری کہ ایک دو لمحوں میں دروازہ کھل جاتا۔ اس نازک وقت میں راجا کے بھائی نے موقعے کی مجبوری کے پیش نظر بندوق اٹھائی اور مولوی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھی پلٹے اور فرار ہو گئے۔[1]

ہومز کہتا ہے کہ مولوی نے مقابلے کی صورت دیکھی تو بات چیت شروع کر دی:

لیکن اس پر جلد واضح ہو گیا کہ زور و قوت سے کام لیے بغیر داخلہ ممکن نہیں، لہٰذا اس نے مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی سے دروازے پر ٹکر لگوائے۔ اس وحشی حیوان نے فصیل شکن آلے کی طرح زور سے ٹکر ماری۔ دروازہ پھٹ کر گرنے ہی والا تھا کہ راجا کے ملازموں نے ایک باڑ ماری اور مولوی کو ہلاک کر ڈالا۔[2]

ساورکر کا بیان

ساورکر نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے راجا اور اس کے بھائی کو جنگی تیاری کے ساتھ کھڑے دیکھا تو صورت حال کا اندازہ کر لیا، لیکن بے باکانہ قدم آگے بڑھایا اور بات چیت شروع کر دی:

بدبخت راجا جو قلعے کی دیوار پر کھڑا تھا، اس بہادر قلب کی صدائے درد کا صحیح اندازہ کب کر سکتا تھا، جس نے عزم مصمم کر رکھا تھا کہ اس وقت تک تلوار نہ چھوڑوں گا جب تک یا تو اجنبی اس سرزمین سے نکل جائیں گے یا خود میرے سر پر تاجِ شہادت نہ رکھا جائے گا۔ جب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بزدل راجا بہ طیب خاطر دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہیں تو مولوی صاحب نے مہاوت کو حکم دیا کہ جس ہاتھی پر میں بیٹھا ہوں اُسے آگے بڑھاؤ اور اس سے قلعے کا دروازہ تڑواؤ۔ طاقتور جانور کی ایک اور ضرب لگ جاتی تو دروازہ کھل جاتا، لیکن راجا کے بھائی نے نشست باندھی اور اس بدبخت بزدل نے احمد اللہ شاہ کو شہید کر ڈالا۔[3]

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۸۰۔ [2] ہومز صفحہ ۵۱۲-۵۱۳۔ [3] ساورکر صفحہ ۳۶۹ - ۳۷۰۔

غدّاری کا انعام اس واقعے کے بعد دونوں بھائیوں نے مولانا کا سر کاٹا اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر تیزی سے شاہ جہاں پور گئے۔ مجسٹریٹ کے بنگلے پر پہنچے تو وہ دوپہر کے کھانے پر بیٹھ چکا تھا۔ انھوں نے اندر جاکر بنڈل کھولا اور اس بے مثال مجاہد آزادی کا سر انگریز مجسٹریٹ کے قدموں پر ڈال دیا۔ اس میں سے خون جاری تھا:

> دوسرے دن مہذب انگریزوں نے اس مجاہد کا سر کوتوالی کی عمارت پر لٹکوادیا جس نے ایسی شجاعت و مردانگی اور ایسی بلند ہمتی سے جنگ کی تھی اور پوائیں کے بھاری بھرکم وحشی کو غداری کے ملعون فعل کے معاوضے میں پچاس ہزار روپے دیے۔[۱]

عجیب بات یہ ہے کہ یہی راجا پوائیں تھا جس نے ابتدا میں انگریزوں کو اپنے ہاں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ نہ ابن الوقت راجا کو رنگ بدلنے میں دیر لگی اور نہ ابن الوقت انگریزوں کو اس کا مربی اور سرپرست بن جانے میں تکلف محسوس ہُوا۔

یہاں یہ حقیقت بھی بیان کر دینی چاہیے کہ انگریزوں نے ذاتی اغراض کی بناء پر پوائیں کے راجا کو انعام سے نوازا لیکن اہل ملک نے اسے کبھی معاف نہ کیا، خواہ وہ مولانا احمد اللہ شاہ کے ہم نوا تھے یا نہ تھے۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کی درمیانی سرحد کے دونوں جانب جو زمیندار مقیم تھے، ان میں سے بہتیروں نے

> راجا پوائیں کے طرزِ عمل پر سخت غصّے اور ناراضی کا اظہار کیا اور انھوں نے حتی الامکان بدترین غداری کے اس فعل کی سزا دینے کے لیے ہتھیار سنبھال لیے۔[۲]

اعتراف فضائل اب آپ اہل وطن کی زبان سے نہیں بلکہ دشمن انگریزوں کی زبان سے احمد اللہ شاہ کے فضائل کا اعتراف سنیں۔

---

[۱] ساورکر صفحہ ۴۷۰۔ پچاس ہزار روپے یا پانچ ہزار پونڈ کے انعام کا اعلان وائسرائے نے پہلے سے کر رکھا تھا۔

[۲] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۱۹۱۔

۱۔ میلی سن کہتا ہے، مولوی بڑا ہی غیر معمولی آدمی تھا۔ سر ٹامس سٹین کو اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے متعدد موقعے ملے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ "مولوی عظیم الشان صلاحیتوں کا آدمی تھا۔ حوصلے اور ہمت میں بیباک عزم میں استوار و پائیدار اور باغیوں میں یقینی طور پر بہترین سپاہی"۔ یہ اندازہ کیا جا چکا ہے اور اس کے خاصے وجوہ موجود ہیں کہ غدر سے پیشتر مولوی ہندوستان کا دورہ کرتا رہا مقصود یہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس اقدام کے لیے جذبہ پیدا کرے، جس کا منصوبہ سازش کے بانی سوچے بیٹھے تھے۔ اس کی فوجی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے لیکن اس سے بڑا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ صرف وہی تھا جس نے سر کالن کیمبل سپہ سالار کی تمام تدبیریں دو مرتبہ ناکام بنائیں۔[1] پھر لکھتا ہے:

> اگر محبِ وطن ایسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لیے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو رمیدان جنگ سے باہر، قتل کے داغ سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اس نے قتل کے کسی بھی واقعے سے چشم پوشی گوارا نہ کی۔ وہ ان اجنبیوں کے خلاف مردانگی، بلند ہمتی اور استقامت سے میدان جنگ میں لڑتا رہا جو اس کے وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں کی جانب سے عزت و احترام کی مستحق ہے۔[2]

ہومز کہتا ہے:

> مولوی اگرچہ حیدر علی اور سیواجی کا ہم پایہ نہ تھا لیکن غدر ہند میں جو آدمی ہمارے خلاف لڑے اُن میں سے وہ غالباً سب سے زیادہ قابل اور یقیناً سب سے زیادہ صاحب عزیمت تھا۔[3]

میکمن[4] احمد اللہ کی شہادت اور راجا پوائیں کو پچاس ہزار کے انعام کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:

> برطانیہ کے اس سخت نزیل دشمن کا غیر متوقع انجام سر کالن کے تمام

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۷۹ ؛ [2] ایضاً صفحہ ۳۸۱ ؛ [3] ہومز صفحہ ۵۰۶ ؛

[4] MAC MUIN ؛

> ہماری جیوش کے مقابلے میں روہیل کھنڈ کے اندر امن قائم کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ثابت ہؤا۔[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ امن فوجی قوت کے بل پر قائم نہ ہؤا۔ صرف اس وجہ سے قائم ہؤا کہ احمد اللہ شاہ کے بعد ملکی قوتوں کو منظم کر کے لڑانے والا کوئی نہ رہا۔

مولانا فضل حق

مولانا فضل حق مرحوم خیرآبادی نے بھی مولانا احمد اللہ کا ذکر اجمالاً اپنی کتاب میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> اس موقع پر متسلط نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لیے ایک اور ہمت کا عامل اُٹھ کھڑا ہؤا۔ اس نے خیرات و مبرات اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، ہادیٔ رسول ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی ہلے میں شکست دے دی۔[2]

اس کے بعد مولانا فضل حق، شاہ صاحب کی شہادت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انگریز بھاگ کر ایک قصبے کے ہندو زمیندار کے مستحکم حصار میں پناہ گزین ہوئے اور اپنے اکابر کے پاس پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ چنانچہ مدد آ گئی۔ احمد اللہ شاہ سے کافر زمیندار نے داؤ کھیلا۔ قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں یعنی مجاہدین اور انگریز کے درمیان مقابلہ شروع ہوگا تو میں چار ہزار کا لشکر لے کر مجاہدین کی امداد کے لیے آ جاؤں گا۔ احمد اللہ شاہ نے اس وعدے پر اعتماد کر کے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ ہؤا یہ کہ سامنے سے نصاریٰ نے گولیاں برسائیں، پیچھے سے اس غدار زمیندار نے آتشباری کی۔ اس طرح احمد اللہ شاہ نے شہادت پائی اور ان کی جماعت نے بھی سردار کے نقش قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔[3]

شہادت کی سابقہ کیفیت کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس ہے، تاہم عام روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ روایت صرف مولانا فضل حق کی ہے۔

مولانا کا حلیہ

میلی سن نے احمد اللہ شاہ کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا قد لمبا، جسم دبلا پتلا لیکن خوب مضبوط تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، بھویں گھنی، ناک کا

---

[1] سر جارج ہیکمن کی کتاب صفحہ ۲۴۴۔ [2] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان صفحہ ۴۰۸۔ [3] ایضاً صفحہ ۴۰۹-۴۱۰۔

بانسا اونچا اور جبڑے پتلے تھے[1]۔ مفتی انتظام اللہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سر کے بال کالے تھے اور زلفیں دونوں کاندھوں پر لٹکتی رہتی تھیں[2]۔

بادشاہی کا اعلان کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے ایک وقت میں اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کر دیا تھا اور سکہ مضروب ہوا جس پر یہ بیت منقوش تھی:

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ[3]

ہومز نے بھی لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے شاہ ہندوستان کا خطاب اختیار کر لیا تھا:

> اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ حکمرانی کی قابلیت کے لحاظ سے ساتھی باغیوں کے مقابلے میں وہ بادشاہی کے لیے سب سے بہتر استحقاق رکھتا تھا[4]۔

مجھے اس دعوے کو صحیح ماننے میں تامل ہے۔ مولانا جب تک لکھنؤ میں تھے، برجیس قدر وہاں کا حاکم تھا اور حضرت محل سارے معاملات کی مختار تھی۔ شاہ جہان پور کے دور میں بھی حضرت محل موجود تھی لہٰذا مولانا کے لیے شاہی کا اعلان بے محل تھا۔ نیز انھیں ایسی کسی شے سے کوئی دل بستگی نہ تھی۔ وہ صرف وطن کو اجنبی تسلط سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ بایں ہمہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص وقت میں عہدے کی حرص کے لیے نہیں بلکہ قومی قوتوں کی تنظیم کے لیے اعلان شاہی ناگزیر ہو گیا ہو۔ تاہم محولہ بالا دعویٰ قطعاً قابل قبول نہیں۔

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۷۹۔ [2] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، صفحہ ۳۴۳۔
[3] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۷۔ [4] ہومز صفحہ ۵۱۲۔

ڈھونڈوپنت نانا

میراث مرہٹوں کے آخری پیشوا باجی راؤ ثانی نے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے تو اس کے لیے آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر ہُوا تھا۔ ساتھ ہی کہہ دیا گیا تھا کہ وہ شمالی ہند میں اپنے قیام کے لیے جو جگہ مناسب سمجھے تجویز کرے۔ باجی راؤ نے بٹھور کو پسند کیا جو کان پور سے چند میل کے فاصلے پر مغربی سمت میں دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ حکومت انگلشیہ نے چھ میل کے حلقے کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا اور حد بندی کے لیے جا بجا پتھر نصب کر دیے۔

باجی راؤ نے چونتیس سال بٹھور ہی میں گزارے۔ اسے بیٹے کی بڑی آرزو تھی، اس غرض سے چھ شادیاں ۱۸۱۶ء سے پیشتر پونا میں کیں اور پانچ بٹھور میں، لیکن نرینہ اولاد سے محروم رہا[1]۔ بالآخر اس نے تین بچوں کو متبنّیٰ بنالیا، اوّل ڈھونڈوپنت نانا، دوم پنڈورنگ راؤ، سوم گنگادھر راؤ۔ پنڈورنگ راؤ اس سے پہلے فوت ہو چکا تھا، لہٰذا اس کے بیٹے سداشیوپنت عرف راؤ صاحب کو باپ کی جگہ مل گئی۔ چنانچہ باجی راؤ نے اپنے وصیت نامے میں ان تینوں کا ذکر صریحاً کیا تھا۔ آخر میں لکھ دیا تھا کہ میرے بعد میرا بیٹا ڈھونڈوپنت نانا "مکھ پردھان" ہوگا اور اسی کو پیشواؤں کی گدی کا واحد مالک سمجھا جائے[2]۔

گویا نانا اگرچہ پیشواؤں کی نسل سے نہ تھا لیکن اسے میراث پیشواؤں ہی کی مل گئی۔

خاندان نانا کے والد کا نام مادھو راؤ نرائن بھٹ بتایا گیا ہے۔ وہ بہت ہی غریب برہمن تھا۔ وِنی گاؤں اس کا اصل وطن تھا، جو بھور گھاٹ[3] کے قریب ہے۔ جب اُسے معلوم ہُوا کہ باجی راؤ پیشوا کے دل میں برہمنوں

---

[1] مرہٹوں کی تاریخ (انگریزی) از کن کیڈ، جلد سوم صفحہ ۲۲۲۔ [2] کیئی جلد اول صفحہ ۱۰۱ حاشیہ۔ [3] یہ مقام پونا کے شمال مغرب میں اس ریلوے لائن پر ہے جو بمبئی سے پونا جاتی ہے اور تقریباً دونوں کے وسط میں ہے۔

کی بڑی قدر ہے، ان کا احترام بھی کرتا ہے اور انھیں دان بھی دل کھول کر دیتا ہے تو اپنے وطن مالوف سے نکل کر ۱۸۲۷ء کے اوائل میں وہ بٹھور پہنچا۔ ۶ جون ۱۸۲۷ء کو نانا نے مادھوراؤ نرائن بھٹ کے بیٹے ڈھونڈو پنت کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ اس سے بڑے اعزاز کی اُمید مادھوراؤ نرائن بھٹ کو نہ ہو سکتی تھی

ساورکر نے لکھا ہے کہ اس بچے نے باجی راؤ کا دل موہ لیا تھا اور تمام درباری اسے بہت پیار کرتے تھے بچے کے جوہر ذہانت، اس کے متین انداز اور غیر معمولی سمجھ بوجھ نے باجی راؤ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اُسے متبنیٰ بنانے کا فیصلہ کر لیا اور ۷ جون کو متبنیٰ بنانے کی رسم عمل میں آئی[1]۔

ناناکی تاریخ پیدائش

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نانا کی تاریخ پیدائش کیا تھی؟ اس بارے میں کسی بھی کتاب نے تعیین نہیں کیا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ متبنیٰ بنائے جانے کے وقت نانا کی عمر صرف اڑھائی سال کی تھی[2]۔ گویا اس کی پیدائش ۱۸۲۴ء کے اواخر یا ۱۸۲۵ء کے اوائل میں ماننی چاہیے۔ کیئی کا بیان ہے کہ جب باجی راؤ کا انتقال ہوا یعنی ۱۸۵۱ء میں تو اس کا وارث ستائیس برس کا تھا[3]۔ اس سے بھی ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء ہی کی تاریخ درست ثابت ہوتی ہے گویا نانا پیدا وِنی گاؤں میں ہوا لیکن اس کی پوری تربیت بٹھور کے محل میں ہوئی۔

ہم بے تکلف یقین کر سکتے ہیں کہ نانا بہت ہی خوبصورت اور من موہن ہوگا، ورنہ ایک غریب برہمن کے بچے کو دیکھتے ہی باجی راؤ اپنی دولت ہی نہیں بلکہ اپنی مسند کا بھی وارث بنانے کے لیے کیوں تیار ہوگیا؟ بچے کی عمر ایسی نہ تھی کہ اس کی کسی خاص خدمت پر دل خوش ہوا ہوتا یا اس کے فہم و فکر، عقل و دانش اور تدبر و تدبیر نے متاثر کیا ہوتا۔ ہوئے متاثر کر سکتی تھی، وہ صرف بچے کی شکل صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بڑی ہی دلکش اور غیر معمولی طور پر جاذبِ نظر ہوگی۔

تربیت

زمانے کے مذاق اور رواج کے مطابق نانا کی تربیت اور تعلیم ہوئی، دوسرے علوم و السنہ کے علاوہ اس نے انگریزی بھی پڑھی ہوگی۔ کان پور کے واقعات کے سلسلے میں ایک انگریز کا ذکر آتا ہے جو بٹھور میں اتالیق رہ چکا تھا اور انگریزی زبان کی تعلیم دیتا تھا۔ بعد میں نانا انگریزوں سے بے تکلف ملتا اور بات چیت کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی خوب جانتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے شہسواری، تفنگ زنی اور شمشیر زنی بھی سیکھ لی ہوگی، بلکہ دوسرے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی پوری آگاہی حاصل کر چکا ہوگا۔ ساورکر نے اسپ سواری، فیل سواری اور تعلیم کا ذکر کیا ہے جس میں نانا کے ساتھ اس کا چچیرا بھائی اور منو بائی بھی شریک ہوتے تھے، جو آگے چل کر لکشمی بائی کے نام سے

۱۔ ساورکر ص۲۳ ۔ ۲۔ ایضاً ایضاً ۔ ۳۔ کیئی جلد اول ص۱۰۱ ۔

شہرت پذیر ہوئی یعنی رانی جھانسی[1]

باجی راؤ کی وفات

۱۸۵۱ء میں باجی راؤ فوت ہوا۔ اس نے اپنے پیچھے بہت بڑی جایداد چھوڑی، جس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے، سولہ لاکھ روپے سرکاری تمسکات کی شکل میں، دس لاکھ کے جواہرات اسّی ہزار روپے کے سنہری زیور اور بیس ہزار روپے کی نقرئی چیزیں، تین لاکھ کی مُہریں یا اشرفیاں۔ یعنی کل تیس لاکھ روپے۔

اس کے ساتھ معاہدے کا مفہوم یہی تھا کہ وظیفہ برابر پشت بہ پشت ملتا رہے گا۔ ویسے بھی اس کے پس ماندوں کا گزارا اسی صورت میں بہ اطمینان ہو سکتا تھا کہ پُورا وظیفہ یا اس کا ایک حصّہ جاری رہتا۔ کمشنر اور مجسٹریٹ دونوں کی رائے اور سفارش یہ تھی کہ وظیفہ جاری رہنا چاہیے لیکن صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر ٹامسن کی رائے اس کے بالکل خلاف تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اہلِ خاندان میں سے کسی کو کوئی اُمید نہ دلائی جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ جلد سے بھٹور کو چھوڑ کر دکن چلے جائیں۔

باجی راؤ نے وظیفہ خواری کے زمانے میں انگریزوں سے نہایت خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔ کن کیڈ لکھتا ہے کہ ایک موقع پر چھ لاکھ روپے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہ طور قرض دیے۔ سکھوں سے جنگ چھڑی تو باجی راؤ نے اپنے خرچ سے دو رجمنٹیں تیار کیں، ایک سوار اور دوسری پیادہ اور یہ حکومت انگلشیہ کے حوالے کر دیں[2]۔

تاہم انگریزوں کو معاہدے کی بدیہی اخلاقی ذمّہ داریاں یا باجی راؤ کے احسان پرور طرزِ عمل کا کیا احساس ہو سکتا تھا۔ وُہ جانتے تھے کہ خاص وقت گزر چکا ہے، مرہٹے ہمیشہ کے لیے مِٹ چکے ہیں اور اب وُہ اُٹھ نہیں سکتے لہٰذا کیوں اپنی گردن پر آٹھ لاکھ سالانہ کا بوجھ باقی رکھا جائے؟ چنانچہ پس ماندوں کو بتا دیا گیا کہ متوفی پیشوا نے چوبیس سال میں بہت کچھ جمع کر لیا ہے، اسی پر قناعت کی جائے اور حکومت سے کوئی اُمید نہ رکھی جائے۔

ساورکر کے تاثرات

ساورکر نے باجی راؤ کے خلاف نہایت تیز و تند اور شدید تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> باجی راؤ پر ایک بھی آنسو نہ بہانا چاہیے۔ اس لیے کہ اس نے اپنی سلطنت ۱۸۱۸ء میں ضائع کی۔ پھر پیشواؤں کے نام کو بٹا لگانے والا یہ شخص دوسرے بادشاہوں کی سلطنتیں

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۵ ۔ [2] کن کیڈ جلد سوم صفحہ ۲۲۲ ۔

برباد کرانے میں امداد کے لیے وقف رہا۔ کمپنی کی حکومت سے اسے جو آٹھ لاکھ روپے
ملتے تھے، ان میں سے بہت کچھ بچا لیا اور کمپنی کو قرض دینے میں یہ بچت صرف کی۔
بعد میں انگریزوں نے افغانستان کے خلاف جنگ چھیڑی تو باجی راؤ نے اپنے
بچائے ہوئے روپے میں سے پچاس لاکھ روپے کمپنی کو اُدھار دیے۔ کچھ دیر اور گزر
گئی اور انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ . . . . . . تو
اس باجی راؤ نے جو سیواجی اور اس کے اخلاف کا پیشوا تھا، اپنی جیب سے روپیہ خرچ
کرکے ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیادے انگریزوں کی امداد کے لیے بھیجے[1]۔

گویا باجی راؤ کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے تو کوئی فوج نہ تھی، لیکن دشمنوں کو تقویت پہنچانے اور امداد دینے کے لیے فوج مل گئی!

یہ سب کچھ درست ہے، لیکن اس زمانے میں اکثر ذی اثر اور ذی ثروت افراد کا پیمانۂ فکر و نظر یہی تھا۔ جن سکھوں کی سلطنت برباد کرانے میں باجی راؤ نے نمایاں حصّہ لیا تھا، اُنھوں نے بھی تو اپنی تذلیل اور اپنے قومی و وطنی نقصان کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جنگ آزادی میں انگریزوں ہی کو تقویت پہنچائی بلکہ دہلی میں کامیابی و کامگاری کی تمام اُمیدوں کو برباد کرنے کے سب سے بڑے ذمّہ دار سکھ ہی تھے۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ انگریزوں پر اتنے احسان کرنے والے باجی راؤ کے پس ماندوں سے جو سلوک ہُوا، اس کی بھی مثال کہیں ملتی ہے اور دوست کُشی، احسان فراموشی کے ایسے واقعات کسی قوم کے لیے زیبا سمجھے گئے ہیں؟

پنشن کے لیے تگ و دو

باجی راؤ کے تمام معاملات کا ناظم صوبیدار رام چند پنت تھا، جسے بڑا منتظم مانا جاتا ہے۔ اس نے انتہائی خلوص، سرگرمی اور ہمت سے کوشش شروع کر دی کہ وظیفہ جاری رہے۔ اس نے لکھا کہ نانا صاحب کمپنی ہی کو اپنے والد متوفیٰ مہاراجا کی جگہ محافظ اور حامی و ناصر جانتے ہیں اور اُنھیں یقین ہے کہ وظیفہ بدستور جاری رہے گا۔ اس کا انحصار صرف حکومت انگلشیہ کی مہربانی اور کشادہ دلی پر ہے[2]۔

لارڈ ڈلہوزی کو کب یہ منظور تھا کہ کمپنی کی حکومت پر آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا بوجھ جاری رہے۔ اُس نے ٹامسن کی رائے سے اتفاق کیا اور باجی راؤ کا وظیفہ پُورے کا پُورا ضبط کر لیا گیا۔

---

[1] ساورکر صفحہ ۲۶۔ [2] کیئی جلد اوّل صفحہ ۱۰۳۔

ولایت میں عرض داشت

جب نانا پر واضح ہو گیا کہ حکومت ہند سے کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس باقاعدہ عرض داشت بھیجی جائے۔ اس عرض داشت کے بعض اجزا مختلف کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یقیناً اس کا انداز و اسلوب خوشگوار نہیں۔ ممکن ہے حالات یا ضرورت استدلال نے ناخوشگواریوں کا صحیح احساس نہ ہونے دیا ہو۔ خلاصہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ حکومتِ ہند نے جو مسلک اختیار کیا، وہ متوفی مہاراجا کے ان بے شمار متوسلین کے لیے محض بے حسی ہی پر مبنی نہیں، جو کمپنی کے وعدوں پر بھروسا کیے بیٹھے رہے، بلکہ اس شخص کے تعلق میں شایانِ شان بھی نہیں جو حکمرانوں کے ایک طویل سلسلے کا نمایندہ ہے؟

۲۔ یہ مسلک تمام معاہدوں کی روح و معنویت کے خلاف ہے۔

۳۔ یہ مسلک اس کے بھی خلاف ہے جو حکومت نے دوسرے حکمرانوں کے اخلاف کے لیے اختیار کیا، مثلاً حکمران میسور (ٹیپو سلطان) شمشیر بدست لڑتا ہوا مقتول ہوا تاہم ایسے جانی دشمن کے فرزندوں کو بھی کشادہ دلی سے وظیفہ دیا گیا۔ بادشاہ دہلی کو قید سے نکال کر تختِ حکومت پر بٹھایا گیا اور اس کے لیے خاصی رقم کا انتظام کیا گیا۔ کیا پیشواؤں کے حقوق مفتوح حکمران میسور اور اسیر مغل بادشاہ سے بھی کم ہیں؟

۴۔ ہندو شاستروں کے رو سے متبنیٰ حقیقی بیٹے کے برابر ہوتا ہے۔ عدالتوں کے فیصلے اسی کے مطابق ہو رہے ہیں۔ حکومت جب تک ہندو دھرم کی اس رسم کو ختم نہ کر دے پیشوا کے متبنیٰ کو وظیفہ دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔

۵۔ اس مفروضے کی بنا پر وظیفے سے انکار تعجب انگیز ہے کہ پیشوا نے پس ماندوں اور متوسلوں کے لیے خاصا ترکہ چھوڑا ہے۔ وظیفہ متوفیٰ باجی راؤ اور اس کے متوسلین کے لیے مقرر ہوا تھا۔ اس رقم کے خرچ ہونے یا بچ رہنے کو اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ معاملہ محض اہل خاندان ہی کے گزارے کا نہیں بلکہ وفادار متوسلین کی ایک بہت بڑی جماعت ہے جنھوں نے پیشوا کی تمام جلاوطنی خوشی خوشی قبول کر لی۔

۷۔ دیسی حکمران اگرچہ اختیارات سے محروم ہو چکے ہیں تاہم انھیں اپنی عزت اور درجہ برقرار رکھنے کے لیے خاصا خرچ پڑتا ہے۔ چونتیس لاکھ کی آمدنی والی ریاست میں سے آٹھ لاکھ کی رقم ایسی نہیں جو پیشِ نظر مصارف کے لیے زیادہ ہو۔

۸ - اگر بچت کی بناء پر وظیفہ بند کر دینا مناسب قرار دیا جاتا ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ متوفی مہاراجا کی کفایت شعاری اور احتیاط کوئی جرم تھی؟ کیا اس بناء پر مسلّمہ معاہدے کے خلاف وہ وظیفہ بند کر دینا مناسب ہے جو متوفی اور اس کے متوسلین کے لیے تجویز ہوا تھا؟[1]

یہ عرض داشت ۹ر دسمبر ۱۸۵۲ء کو بھیجی گئی تھی، لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا یہ بھی بے اثر رہی۔

وکلا کا ارسال

ابھی ولایت سے کوئی جواب نہ آیا تھا کہ نانا نے اپنے وکیل ولایت بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید اس خیال سے کہ بعض دوسری مسندوں کے دعوے داروں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

کیئی کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وظیفے کے جاری رہنے کی نسبت بے یقینی کا مسئلہ باجی راؤ کی زندگی ہی میں سامنے آگیا تھا اور اس زمانے میں صوبیدار رام چندر کے بیٹے کو ولایت بھیجنے کی تجویز ہوئی تھی۔[2] لیکن عرضداشت کے بعد جب مناسب سمجھا گیا کہ خاص وکیل یا نمایندے ولایت بھیج کر کوشش کرنی چاہیے تو عظیم اللہ خاں کو بھیجا۔ ساتھیوں میں سے نانا کے چچیرے بھائی بالا صاحب اور محمد علی خاں عرف جیمی گرین اور ایک انگریز بڈل کے نام ہمیں معلوم ہیں اور آدمی بھی ہوں گے۔ اس وکالت کے حالات عظیم اللہ خاں کے سوانح میں بیان کیے جا چکے ہیں اور انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

صرف اتنا بتا دینا چاہیے کہ عرضداشت کا جواب آنے سے پیشتر یہ لوگ ولایت روانہ ہو چکے تھے۔ جواب یہ آیا کہ وظیفہ موروثی نہ تھا اور متبنّیٰ کا دعویٰ ناقابل قبول ہے۔ وکیلوں کی مساعی بھی سراسر ناکام رہیں۔

غصّہ اور جوشِ عمل

ظاہر ہے کہ انگریزوں کا یہ برتاؤ نانا صاحب کے دل میں اچھے جذبات پیدا نہ کر سکتا تھا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس واقعے سے پیشتر نانا کے دلی خیالات کیا تھے؟ آیا وہ پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف سازباز کی تدبیریں سوچ رہا تھا یا اس نے وظیفے کی بندش کے بعد جوش اور غصّے کی حالت میں مخالفت کا فیصلہ کیا، جس طرح کہ ہم بعض دوسرے مجاہدین کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں، مثلاً جھانسی کی رانی لکشمی بائی۔ جس حد تک میدانِ عمل میں مجاہدات کا تعلق ہے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مجاہد نے کب سے کام شروع کیا یا اس کے محرکات کیا تھے؟ بعض حساس اور بالغ نظر شخصیتیں اجنبیوں اور بیگانوں کے نفسِ تسلّط ہی کو برداشت نہیں کرتیں اور مناسب موقعے کی تلاش میں رہتی ہیں، بعض کو بیگانوں کا غیر ہمدردانہ بلکہ حق سوز طرزِ عمل متنبہ کر دیتا ہے اور ان کی سوئی ہوئی قوتِ مجاہدہ جاگ اٹھتی ہے۔ بعض آخری وقت تک بیدار نہیں ہوتے۔

---

[1] کیئی جلد اول صفحہ ۱۰۴-۱۰۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۳۔

نانا صاحب میرے نزدیک دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قماش کے آدمی آہستہ آہستہ تذبذب کے چکر سے باہر آتے ہیں اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، نانا صاحب پر خاصی دیر تک تذبذب طاری رہا لیکن جب یہ طلسم ٹوٹا تو پھر اس نے آخری دم تک اسی مسلک کی پیروی و پابندی جاری رکھی جس کی اُمید ایک غیور محبِ وطن سے ہو سکتی تھی۔

خفیہ تنظیمات

ساورکر نے لکھا ہے کہ نانا نے خفیہ تنظیمات شروع کر دی تھیں۔ اس نے بہت سے برہمن، درویش اور عالم اپنے ساتھ ملائے اور اُنھیں ملک کے مختلف حصّوں میں بھیج دیا۔ عظیم اللہ خاں ولایت سے آیا تو وہ نئے خیالات لے کر آیا۔ اس نے ترکوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ممکن ہے جنگ کریمیا میں انگریزی فوج کی درگت نے اُسے یقین دلا دیا ہو کہ ہمّت کی جائے تو انگریزوں کو پاک و ہند سے باہر نکال دینا کچھ مشکل نہیں۔ جو حالات اب تک روشنی میں آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے ساز باز کے سلسلے زیادہ تر ولایت سے وکیلوں کے ناکام آنے کے بعد شروع ہوئے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ میرے نزدیک بہ طور خود جہاد کے لیے تنظیمات شروع کر چکے تھے۔ اغلب ہے عظیم اللہ خاں اور نانا سے ملنے کے بعد اُنھوں نے سرگرمیوں میں اِک گونہ وحدت و یکجہتی کا بندوبست کر لیا ہو

نانا کا دورہ

انگریزی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ نانا نے ۱۸۵۷ء کے اوائل میں ایسی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں جن کا وہ عادی نہ تھا اور انگریز ان پر متحیر ضرور تھے لیکن اُنھیں کوئی شبہ پیدا نہ ہوا۔ مثلاً وہ کالپی گیا، پھر دہلی پہنچا، بعد ازاں لکھنؤ گیا۔ عظیم اللہ خاں اس کے ساتھ تھا۔ لکھنؤ میں ان کے طرزِ عمل سے کچھ شبہات پیدا ہوئے تاہم انھیں کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ علاوہ بریں انبالہ اور کالکا جانا بھی ثابت ہے۔[1]

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، اس بارے میں زیادہ شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے یا اُسے جاننا چاہیے کہ بڑی تحریکیں اُٹھانے کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا جاتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک کا اہتمام انھیں لوگوں نے کیا ہوگا جو اس میں ممتاز حیثیت کے کارفرما تھے اور جنھوں نے یا تو میدانِ جنگ میں جانیں دے دیں یا گرفتار ہوئے اور پھانسی پا گئے یا حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کے مستوجب ٹھہرے یا اُنھوں نے سب کچھ لُٹا چکنے کے بعد غربت کی زندگی اختیار کر لی، اس لیے کہ اگر وطن میں اطمینان اور عزت سے رہنے کی صورت پیدا نہ ہو تو اس سے باہر نکل جانا اور اصل نصب العین کی یاد میں زندگی گزار دینا ہزار درجہ بہتر ہے۔ وطن اسی صورت میں محبوب ہے کہ اس کے اندر محبوبیت کے خاص پہلو موجود ہوں یا ان پہلوؤں کے لیے جدوجہد کا موقع حاصل ہو۔ اگر دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھر اسی میں جاذبیت

---

[1] کیی ص۵۷-۵۸، ہومز ص۹۰-۹۱۔ [2] ساورکر ص۷۹۔

کالون سا جو ہر باقی رہ جاتا ہے؟ یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ انگریز چھان بین کر کے جس نتیجے پر پہنچے تھے، یہ تھا کہ تحریک جہاد آزادی کے بانیوں نے ۳۱ مئی کی تاریخ آغاز جہاد کے لیے مقرر کی تھی، لیکن اتفاقیہ میرٹھ کی فوج نے ۱۰ مئی کو ہنگامہ شروع کر دیا۔ لہٰذا سب کو قبل از وقت اور تیاریاں مکمل کیے بغیر اس میں شریک ہونا پڑا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ۳۱ مئی کو جنگ آزادی شروع ہوتی تو نتیجہ کیا نکلتا اور اس وقت تک کیا کیا کچھ پایہ تکمیل پر پہنچا لیا جاتا لیکن یہ معلوم ہے کہ تیاریاں مکمل کیے بغیر سب کو اس میں شریک ہونا پڑا۔ ناکامی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا۔

نانا سے طلبِ امداد

میرٹھ کے واقعے کے بعد کان پور میں حالات بگڑنے لگے تو وہاں کے ارباب بست و کشاد نے خود نانا سے امداد طلب کی کہ ہمارے خزانے اور میگزین کو بچانے کے لیے اپنے آدمی مقرر کر دیجیے۔ چنانچہ نانا اور اس کے آدمی نواب گنج میں متعین ہوئے۔ اس سلسلے میں تانتیا ٹوپے کا بیان خاص توجہ کا محتاج ہے وہ لکھتا ہے:

> ماہ مئی ۱۸۵۷ء میں کان پور کے کلکٹر[1] نے ایک تحریر نانا کے پاس بٹھور میں بھیجی اور التجا کی کہ میری بیوی بچوں کو انگلستان بھجوا دیا جائے۔ نانا نے یہ التجا قبول کر لی۔ چار روز بعد کلکٹر نے (نانا کو) لکھا کہ بٹھور سے اپنی فوج اور توپیں لے آیے۔ میں (تانتیا) نانا کے ساتھ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی ایک سو سپاہی تھے، تین سو توڑے کی بندوقوں والے آدمی اور دو توپیں۔ ہم کلکٹر کے بنگلے پر گئے۔ وہ اس وقت بنگلے پر نہ تھا۔ بلکہ اس مقام پر تھا جہاں انگریزوں نے قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کا پیغام آیا کہ رات میرے ہی گھر پر گزارو، جو کان پور میں تھا۔ چنانچہ ہم نے رات وہاں گزاری۔ ہم چار روز وہاں ٹھہرے رہے۔ کلکٹر نے کہا کہ بڑا ہی اچھا ہوا تم آ گئے، اس لیے کہ سپاہیوں نے نافرمانبرداری اختیار کر لی ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں جرنیل صاحب سے بھی آپ لوگوں کے متعلق بات کروں گا۔ چنانچہ اس نے بات کی۔ جرنیل نے آگرہ خط لکھا سے جواب آیا کہ ہمارے آدمیوں کے لیے تنخواہ کا انتظام کر دیا جائے گا۔[2]

---

[1] کلکٹر کا نام ہلرس ڈن HILLERSDEN تھا۔ [2] تانتیا کا پورا بیان میلی سن نے جلد پنجم میں دے دیا ہے۔ جس حصے کا ترجمہ متن میں درج ہے یہ اقتباس جلد دوم ص ۲۲۶ کے حاشیے پر منقول ہے۔

یہ اقتباس کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ البتہ اس میں پیچیدگی بڑی عجیب ہے اور اس کے حل کی کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آتی۔ یعنی آیا اس وقت تک ناناؔ نے اُٹھنے کا فیصلہ ہی نہ کیا تھا اور وہ ۳۱ مئی کا انتظار کر رہا تھا؟ یا وُہ خود کسی اقدام میں نمایاں حصّہ لینے پر آمادہ نہ تھا؟ کم از کم یہ ظاہر ہے کہ انگریزوں کو اس وقت تک ناناؔ پر پورا اعتماد تھا۔ نیز وہ اعتماد کے لائق ثابت ہوا اس لیے کہ چار روز یا اس سے بھی زیادہ مدّت تک خزانے کی حفاظت کرتا رہا اور اُسے کوئی نقصان نہ پہنچنے دیا۔

انگریزی ذہنیت کا نقشہ

کان پور کے حالات یقیناً بگڑے ہوئے تھے۔ سپاہی مُسلسل اُنھیں لائنوں پر سوچ رہے تھے، جن لائنوں پر میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات کی سپاہ عمل کر چکی تھی۔ تاہم ہنگامے کے آغاز میں سپاہیوں کو تامل تھا۔ فلیچر ہیز نے ہنری لارنس کے نام ۲۶ مئی کو ایک خط بھیجا تھا، اس میں وہ لکھتا ہے:

> سپاہیوں کی سرکشی اور بغاوت میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ فیصلہ نہیں کر سکے کون سبقت کرے۔ وہ کئی روز سے باہم جھگڑ رہے ہیں۔ ایک دیسی افسر نے رسالے کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا تھا کہ ہتھیار سنبھال کر بغاوت شروع کر دی جائے اور اس نے ایک ترمچی کو ترم بجانے اور اُٹھنے کا سگنل دے دینے پر بھی راضی کر لیا، دوسرے دیسی افسر نے ترم چھین کر ایک طرف رکھ دیا۔[1]

گویا ۲۶ مئی تک تذبذب کی حالت جاری تھی لیکن انگریز اس حالت میں بھی انتہائی بے پروائی سے دیسیوں کے ساتھ بدسلوکی کر رہے تھے۔ مثلاً کاکس[2] نام ایک گورے نے ۲ جون کی رات کو ۲ رسالے کے ایک پہرے دار پر گولی چلا دی۔ گورے پر مقدمہ چلا لیکن دوسرے دن اسے بدیں وجہ بری کر دیا گیا کہ گولی چلانے کے وقت وہ شراب پی کر مدہوش تھا۔ اس واقعہ نے رسالے ہی میں نہیں بلکہ عام سپاہیوں میں حد درجہ بے اطمینانی پیدا کر دی اور اُنھوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ ہو سکتا ہے کسی روز ہماری بندقیں بھی اتفاقیہ سر ہو جائیں۔[3]

آغاز

ناناؔ اس وقت تک خزانے اور میگزین پر پہرہ دے رہا تھا۔ پھر کیا سمجھ لیا جائے کہ پہرہ داری کے دوران میں وہ ساز باز بھی کرتا رہا؟ میلی سن لکھتا ہے:

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۳۱ حاشیہ [2] Cox [3] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۳۲ حاشیہ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسالے کا جو سوبیدار بغاوت کا سرگرم داعی تھا، اس کے اور نانا صاحب ساکن بٹھور کے درمیان بہت جلد ملاقات کا بندوبست کر دیا گیا[۱]

میلی سن خود ہی اعتراف کرتا ہے کہ دیسی گروہوں کے بیانات کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے اس سے خفیہ ملاقاتوں کی پوری تاریخ مرتب کر لینا آسان نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون کے اوائل میں سرکش سپاہیوں کے افسروں اور بٹھور کے محل میں رہنے والوں کے درمیان پے در پے ملاقاتیں ہوئیں۔ سپاہیوں کو علم تھا کہ اگر انھوں نے راہِ بغاوت میں قدم رکھا تو نانا ان کے ساتھ ہو گا[۲]

بہر حال ۴۔ جون کو ہنگامے کا آغاز ہو گیا۔ میلی سن کہتا ہے کہ سپاہی نواب گنج کے حوالی میں پہنچے، نانا کے ملازمین سے بھائی چارہ پیدا کیا، خزانہ لوٹا، جیل کے دروازے کھول دیے اور قیدی چھوڑ دیے۔ سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی اور ریکارڈ جلا دیے، میگزین پر بھی قبضہ کر لیا، جس میں گولی بارود اور بھاری توپیں موجود تھیں[۳]

تانتیا ٹوپے کا بیان

تانتیا ٹوپے نے واقعات کو بالکل دوسری شکل میں پیش کیا ہے۔ اس بیان کی عمومی حیثیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دانستہ توڑ مروڑ سے کام لیا گیا ہے یا نانا کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا بلا کم و کاست اسی شکل میں بیان کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ آگرہ سے ہمارے آدمیوں کے لیے تنخواہ کا انتظام کر دینے کی اطلاع آ گئی تو:

> دو روز بعد تین پیادہ رجمنٹوں اور ۲ رسالے نے ہمیں گھیر لیا۔ نانا صاحب اور مجھے خزانے میں قید کر دیا۔ میگزین اور خزانے میں سے ہر چیز اٹھالی اور کچھ بھی باقی نہ چھوڑا۔ روپے میں سے سپاہیوں نے دو لاکھ گیارہ ہزار روپے نانا کو دیے لیکن سنتری اپنے مقرر کر دیے۔ نانا بھی انھیں سنتریوں کے پہرے میں تھا۔ جو سپاہی ہمارے ساتھ تھے، وہ بھی باغیوں میں شامل ہو گئے[۴]

ہمیں نانا کے دلی انکار و عزائم سے بحث نہیں، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہنگامہ آرائی میں جلد بازی اور تیزی کا خواہاں نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی وہ ہنگامے کے لیے تیار نہ ہو اور سپاہیوں نے واقعی اسے قید کر کے اپنا مطلب پورا کر لیا ہو۔

---

[۱] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۳۱۔ [۲] ایضاً صفحہ ۲۳۲۔ [۳] ایضاً صفحہ ۲۳۴۔ [۴] ایضاً جلد پنجم صفحہ ۳۰۵۔

میرا تاثر یہی ہے کہ تانتیا ٹوپے کا بیان درست ہے، انگریزوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ کسی مستند اطلاع پر مبنی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باغی سپاہی نواب گنج پہنچے، ان کے وفد نے ناناسے ملاقات کی اور کہا: مہاراج، مملکت آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے، لیکن اگر ہمارے دشمنوں کا ساتھ دیا تو موت کی سزا دی جائے گی۔ نانا نے کہا کہ مجھے انگریزوں سے کیا سروکار ہے، میں ہمہ تن تمھارا ہوں۔[1]

اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ نانا بغاوت سے پیشتر سپاہیوں کے ساتھ نہ تھا۔

دہلی کی طرف کوچ اور مراجعت

انگریزی بیانات میں بتایا گیا ہے کہ خزانے اور میگزین کی لوٹ کے بعد سپاہی جلد سے جلد دہلی روانہ ہونے کے خواہاں تھے، اُنھوں نے نانا کو ساتھ لیا اور چل پڑے۔ اُن کے پاس روپیہ تھا۔ سازو سامان جنگ تھا۔ سفر کے لیے گاڑیاں تھیں اور اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ دہلی میں بادشاہ کو گدی پر بحال کر دیا تو بہت انعام ملے گا۔[2]

تانتیا لکھتا ہے کہ فوج نے دہلی کی طرف کوچ شروع کر دیا۔ مجھے، نانا صاحب اور ہمارے آدمیوں کو بھی ساتھ لے لیا۔

> کان پور سے تین کوس جا چکے تو نانا نے کہا کہ دن ختم ہو رہا ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں ٹھہر جائیں اور کل صبح روانہ ہوں۔ سپاہیوں نے یہ بات مان لی اور ٹھہر گئے۔ دوسرے دن صبح کو پوری فوج نے کہا کہ ہمارے ساتھ دہلی چلو۔ نانا نے انکار کر دیا۔ اس پر سپاہیوں نے کہا کہ اچھا ہمارے ساتھ کان پور چلو اور (انگریزوں کے خلاف) جنگ کرو نانا نے اُسے بھی قبول نہ کیا۔ سپاہیوں نے ایک نہ سُنی، اُسے قیدی کی حیثیت میں ساتھ لے کر کان پور کی طرف چل پڑے اور وہاں جنگ شروع ہو گئی۔[3]

مراجعت کے وجوہ

انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ نانا نے اپنے مشیروں خصوصاً عظیم اللہ خاں کے مشورے کے مطابق سپاہیوں کو کلیان پور میں روک لیا تھا۔ پھر اُنھیں ساتھ لے کر کان پور لوٹا۔

اس کے پیشِ نظر یہ حقائق تھے:

۱۔ دہلی گیا تو اس کی حیثیت ثانوی رہ جائے گی، اس لیے کہ وہاں مغل بادشاہ تمام معاملات پر حاوی ہوگا۔

---

[1] فرسٹ: کان پور صفحہ ۷۹۔ [2] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۴۴۔ [3] ایضاً جلد پنجم صفحہ ۳۰۵۔

۲ - کان پور میں رہا تو وہ اپنے معاملات میں مختارِ کل ہوگا ۔

۳ - لکھنؤ، بنارس ، الہ آباد اور آگرہ ہی وُہ بڑے بڑے مقامات تھے جہاں سے کان پور کمک بھیجی جا سکتی تھی - ان شہروں کے حالات نانا پر روشن تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ کچھ مدد نہیں دے سکتے لہٰذا وہ اطمینان سے حکمرانی کی گدی مستحکم کرے گا ۔

۴ - عظیم اللہ خاں یہ بتا ہی چکا تھا کہ ہم پہلے دوآبے پر قبضہ کریں گے ، پھر کلکتہ کی طرف بڑھیں گے اور بڑا علاقہ قبضے میں لے کر اپنے مستقبل کے متعلق بہتر سے بہتر تجویز منظور کرا سکیں گے ۔

محاصرہ اور روانگی

۶ جون سے ۲۷ جون تک کان پور کی انگریزی فوج اور دوسرے انگریز محصور رہے - محاصرے کی تفصیلات زیرِ بحث موضوع سے خارج ہیں - ختمِ محاصرہ کے متعلق بیانات مختلف ہیں :

۱ - انگریز کہتے ہیں کہ ۲۴ جون کو مسز جیکوبی یا مسز گرین وے کے ذریعے سے ایک رقعہ پہنچا ، جس کا مضمون یہ تھا کہ جو انگریز لارڈ ڈلہوزی کے افعال و اعمال سے بے تعلق ہیں ، وُہ اگر ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہوں تو اُنھیں بہ خیر و عافیت الہ آباد بھیج دیا جائے گا - پھر عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد انگریز جرنیل سے ملے اور کشتیوں کے انتظام ، روانگی کے وقت اور رسد کا فیصلہ ہُوا[۱]

۲ - تانتیا کا بیان ہے کہ محاصرہ کے چوبیسویں دن انگریز جرنیل نے صلح کا جھنڈا بلند کیا اور لڑائی بند ہوگئی - اس وقت نانا نے ایک انگریز عورت کے ذریعے سے انگریز جرنیل کو پیغام بھیجا کہ سپاہی میرا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں - میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کے لیے (جرنیل کے لیے) اور آپ کے ساتھیوں کے لیے الہ آباد تک کشتیوں کا انتظام کر دوں جرنیل نے یہ پیش کش منظور کر لی[۲]

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں سے کس بیان کو درست مانا جائے - مجھے تانتیا کا بیان زیادہ قرینِ یقین معلوم ہوتا ہے - اس حقیقت کا اعتراف سب لوگ کرتے ہیں کہ انگریز جرنیل کے پاس رسد ختم ہو رہی تھی - محصورین کی حالت نازک تھی اور وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے - اغلب ہے جرنیل نے صلح کا جھنڈا بلند کیا ہو تو بات چیت کی صورت پیدا ہوگئی ہو - ہاں ، یہ بھی ممکن ہے کہ محاصرین نے ایک بے سود کش مکش کو طول دینے کے بجائے حسنِ تدبیر کے ساتھ اسے ختم کر دینے کے لیے پیغام بھیجا ہو ، یعنی انگریزی بیان بھی بالکل غیر اغلب نہیں ۔

---

۱ میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۵۱-۲۵۲ ۔ ۲ ایضاً جلد پنجم صفحہ ۳۰۵

دردانگیز واقعہ ۲۷- جون کو صبح کے وقت تمام انگریز قلعہ بندیوں سے نکلے ستی چورا گھاٹ پر ان کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ عورتوں اور کمزوروں کے لیے سواریاں بھی مہیا کردی گئیں تھیں جُوں ہی وہ کشتیوں پر سوار ہوگئے تو اچانک حملہ ہوا اور قتل شروع ہوگیا۔ بہت سے مارے گئے یا ڈوب گئے یا اسیر ہوگئے۔

انگریزی بیانات مظہر ہیں، نانا کہ اس کے بھائی بند، عظیم اللہ خاں، تانتیا ٹوپے، ٹیکا سنگھ اور دوسرے لوگ موقع پر موجود تھے۔ انگریزوں نے بعد میں جو شہادتیں لیں، ان میں سے ایک میں بتایا گیا ہے کہ تانتیا ٹوپے نے صوبیدار ٹیکا سنگھ کو حکم دیا اور تاکید کردی کہ ایک انگریز کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔ دوسری شہادت میں بتایا گیا کہ تانتیا ٹوپے نے نانا کے حکم کی تعمیل کرائی۔[۱] مفتی انتظام اللہ کہتے ہیں کہ نانا کے بھائی بالا صاحب نے فسخ عہد کیا اور کشتیوں پر گولیوں کی باڑ ماری۔ اس وجہ سے تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں اور مینا (دختر نانا) نانا سے ناراض ہوگئے۔[۲] سوال یہ ہے کہ اگر اس فعل کا ذمہ دار بالا صاحب تھا نہ کہ نانا تو نانا سے ناراضی کی کون سی وجہ تھی؟

تانتیا نے لکھا ہے کہ جوائی کا فیصلہ ہوجانے کے بعد انگریز جرنیل نے تقریباً ایک لاکھ روپے کی رقم نانا کے پاس بھیج دی کہ اسے محفوظ رکھا جائے۔ نانا کے حکم سے میں نے چالیس کشتیوں کا انتظام کیا۔ سب کو ان میں سوار کرایا اور روانہ کردیا۔

اس وقت سپاہی پانی میں کود پڑے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل شروع کردیا۔

کشتیوں کو آگ لگادی۔ اس طرح انتالیس کشتیاں تباہ ہوگئیں۔[۳]

سپاہیوں کے جوش کا سبب اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سپاہی انگریزوں کے معاملے میں عموماً بے قابو تھے۔ لکھنؤ، دہلی، جھانسی اور بعض دوسرے مقامات پر جو الم افزا واقعات پیش آئے، ان کی وجہ یہی تھی، کیوں؟ اس لیے کہ انگریزوں نے ان کے ساتھ حد درجہ رنجیدہ اور قلق افزا برتاؤ کیا تھا۔ انھوں نے اندھا دھند اہلِ ملک کو قتل کیا تھا۔ انھوں نے جرم و بے جرمی کی تمیز روا نہ رکھی تھی۔ ساور کر نے لکھا ہے کہ کانپور میں جہاں جنگ آزادی کے لیے رضاکار پہنچ رہے تھے، وہاں الہ آباد اور بنارس سے بھی ہزاروں لوگ آئے تھے، جن کے ہم مشربوں کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا گیا تھا۔ سیکڑوں نوجوان تھے، جن کے باپ انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی پا چکے تھے۔ ایسے شوہر بھی تھے جن کی بیویوں اور بچوں کو جنرل نیل نے جلوایا تھا، جن کی جایدادیں تباہ ہوچکی تھیں۔[۴] ان کے دلِ انتقام

---

[۱] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۵۷ حاشیہ۔ میلی سن نے تسلیم کیا ہے کہ ممکن ہے تانتیا نے کشتیوں کی روانگی کا اشارہ کیا ہو اور اسے دیکھنے والے نے قتل کا اشارہ سمجھ لیا ہو۔ [۲] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۱۔ [۳] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۳۰۵۔ [۴] ساور کر صفحہ ۱۸۹۔

کے جذبات سے لبریز تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہ تانتیا ٹوپے کی بات سُن سکتے تھے، نہ نانا کی اور نہ کسی اور کی۔

نیل یا دوسرے انگریز افسر جوشِ وحشت میں سمجھ رہے تھے کہ اہلِ ملک پر جتنے ظلم کیے جائیں گے، جتنی بے دردی سے اُنھیں موت کے گھاٹ اُتارا جائے گا، اتنے ہی حالات پُرسکون ہوتے جائیں گے۔ اُنھیں یہ احساس نہ تھا کہ ظلم و جور کا خمیازہ ان انگریزوں کو بھگتنا پڑے گا جو اہلِ ملک کے قبضے میں تھے۔ نیل نے اوائل جون میں الہ آباد، بنارس اور دوسرے مقامات پر جو ظلم کیے تھے، اُنھوں نے تمام اہلِ ملک کا غصہ دیوانگی کی حد پر پہنچا دیا تھا۔ کان پور میں قتل کے جو واقعے پیش آئے، وُہ یقیناً بڑے رنجدہ اور بڑے افسوسناک تھے اور ان کے لیے کوئی بھی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر کہا جائے کہ ان کی حقیقی ذمہ داری نیل یا اس جیسے دوسرے سنگ دِل انگریز فوجیوں پر عاید ہوتی ہے تو اسے درست ماننے میں کسی کو کیا تامل ہو سکتا ہے؟

نانا کی پیشوائی کا اعلان

یکم جولائی کو نانا کی پیشوائی کا اعلان ہوا، ایک حکم جاری کیا گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ خُدا کے احسان اور شاہنشاہ کے اقبال سے نصاریٰ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ دہلی، پونا، ستارہ اور کان پور غرض ہر جگہ انھیں جہنم رسید کر دیا گیا۔ اب عوام اور کارکنانِ حکومت کو چاہیے کہ اس واقعے پر خوشی کے شادیانے بجائیں اور اپنے فرائض آرام و امن سے انجام دیتے رہیں۔

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے جولائی کو کان پور میں عَلَمِ جہاد کی پرچم کشائی کی تھی۔ اس عہد کے کارکنوں میں سے متعدد کے نام تاریخوں میں آئے ہیں، مثلاً جمال الدین حوالدار، شیر خاں حوالدار، مدد علی ساکن باندہ، ٹیکا سنگھ صوبیدار، شمس الدین صوبیدار، رحیم خاں ساکن بشن پور، حوالدار میجر گوپال سنگھ، سردار بیگ، رائے سنگھ، جمعدار جو خاں، تلیار خاں، قاضی اسماعیل، جسے عظیم خاں کا ایجنٹ بتایا گیا ہے۔ احمد علی خاں وکیل جی، قاضی وصی الدین، اکبر علی، مولوی عبدالرحمٰن ڈاکٹر رحیم خاں، ہلاس سنگھ، اکبر علی، زین العابدین (نانا کا بخشی) مولوی سلامت اللہ، عزیزن طوائف۔

مُنادی اِن لفظوں میں کرائی گئی:

"خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم نانا صاحب اور فوج بہادر کا۔"

کان پور کی تسخیر

بعد کے حالات زیادہ تفصیل کے محتاج نہیں، انگریزی فوج ہیوے لاک کی سرکردگی میں الہ آباد سے روانہ ہوئی:

۱- ۱۲ر جولائی کو فتح پور میں جنگ ہوئی، انگریزوں نے فتح کے بعد شہر کو لوٹنے کی اجازت دے دی۔

۲- ۱۵ر جولائی کو اونگ میں ایک جھڑپ ہوئی۔

۳- اسی دن بالاصاحب (برادر نانا) نے پانڈو ندی پر شکست کھائی اور کان پور کا راستہ کھل گیا۔

۴- نانا نے اس کے بعد بھی لڑائی جاری رکھی لیکن انگریز کامیاب ہوئے اور ۱۷ر جولائی کو کان پور میں داخل ہو گئے۔ وہاں یا دوسرے مفتوحہ مقامات پر اُنھوں نے جو ظلم و جور کیے وہ تاریخ جنگ آزادی کا حصّہ ہیں نہ کہ نانا کے حالات کا۔

۵- ۱۹ جولائی کو انگریزوں نے بٹھور جاکر پیشوائی محل کو تباہ کر دیا اور تمام اشیا پر قبضہ کر لیا۔ نانا اس سے پیشتر دریا عبور کرکے لکھنؤ کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

اسیروں کا قتل

کان پور کے سلسلے میں صرف ایک ضروری واقعہ باقی رہ گیا اور وُہ انگریز اسیروں کا قتل ہے جو پانڈو ندی کی جنگ کے روز پیش آیا۔ اسے سب سے زیادہ دردناک واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ پہلے قتل سے بھی زیادہ رنج دہ ہے، تاہم اس کا بھی خاص سبب تھا۔ "قیصر التواریخ" کا بیان ہے کہ ان قیدیوں کو اچھی طرح رکھا گیا تھا، ایک روز ان کے لباس میلے دیکھے تو حکم دیا کہ دھوبیوں سے لباس دُھلوا دو۔ مہتاب خاں اور محراب خاں برقنداز اِن کے لیے کھانے کا بندوبست کرتے تھے۔ حسینی خانم کھانا بانٹا کرتی تھی :

> مگر میم لوگ گوبندوں کے ہاتھ ہر طرح سے بہ اخفا چٹھیاں اپنے احوال گزران کی لکھ کر بھیجتی تھیں چنانچہ ایک دن دو گوبندے مع چٹھی پکڑے گئے۔ بس یہی ان سب کی قضا کا باعث ہُوا۔

اُدھر بالا راؤ انگریزی فوج کے مقابلے کے لیے روانہ ہُوا، اُدھر نانا نے جھنجلا کر اس بناء پر سب کے قتل کا حکم دے دیا کہ تم نے فوج ہمارے قتل کو بلائی ہے۔[1]

وجہ خواہ کچھ ہو، اس واقعۂ الیمہ کے لیے بھی کوئی عذر معقول یا قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

لکھنؤ میں داخلہ

نانا بٹھور سے نکلا تو لکھنؤ گیا، پہلے اپنا وکیل بھیج کر حضرت محل سے اجازت منگوائی۔ حضرت محل نے نہ صرف اجازت دی بلکہ راجا جے لال سنگھ کو حکم دیا کہ بیس اونٹ، انتیس چھکڑے، دس گاڑیاں، بیس تیس ہاتھی لے کر فتح پور چوراسی جاؤ اور نانا کو لے آؤ۔ نانا بارش ہی میں جیا سنگھ چودھری کی گڑھی سے مع اہل و عیال روانہ ہُوا۔ لکھنؤ پہنچنے پر حضرت محل کے حکم سے پھر راجا جے لال سنگھ نے استقبال کیا، جس کا خطاب نصرت جنگ تھا۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صد ۲۴۹۔

پیشتر شیش محل کو ناناصاحب کے لیے آراستہ کیا جاچکا تھا۔ اس میں شطرنجیاں، چاندنیاں، پلنگ، کرُسیاں اور دوسری چیزیں قرینے سے سجا دی گئی تھیں حتیٰ کہ دیواروں پر تصویریں بھی آویزاں کردی گئی تھیں۔

گیارہ ضرب توپ سے نانا کی سلامی ہوئی۔ پھر حضرت محل نے میر واجد علی کو پرسشِ مزاج کے لیے بھیجا۔ نانا نے کہا کہ اکیس ضرب توپ کی سلامی ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، ورنہ سلامی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میر واجد علی نے جواب دیا کہ اکیس ضرب توپ کی سلامی صرف بادشاہ کے لیے معمول ہے۔

حضرت محل نے پچیس ہزار روپے بطور ضیافت بھیجے اور خلعت بھی دیا، جس کی تفصیل قیصر التواریخ میں یوں بیان کی گئی ہے:

> قبائے زرّیں، شمشیر و سپر، مالائے مرواریدی، دھکدھکی مرصع الماس کی کنٹھہ مروارید۔
> نورتن مرصع، دست بند مروارید، دوشالہ، رومال پرمتن زرّیں کارلبادہ، کمربند،
> شال، اسپ مع ساز و زین نقرہ، ہاتھی مع ہودج نقرہ[۱]

لکھنؤ سے نکلنے کے بعد جب تک انگریز لکھنؤ نہ پہنچے، نانا وہیں رہا۔ جب انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہ بھی اپنا سامان چھکڑوں میں لدوا کر چلا گیا۔ شاہ جہان پور کی جنگ میں مولانا احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعدازاں حضرت محل کے ہمراہیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ:

۱ - ۱۵ر دسمبر کو کالن کیمبل بہرائچ پہنچا تو معلوم ہُوا کہ حضرت محل اور نانا اس پر قابض تھے۔ ۱۴ر دسمبر کو اُسے خالی کیا تھا[۲]

۲ - ۲۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو کیمبل نانپارہ پہنچا تو طلایہ گرد خبر لائے کہ نانا صاحب اور بینی مادھو چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ نیکی میں مقیم ہے، جو نانپارہ سے بیس میل شمال میں دریائے راپتی پر واقع ہے[۳]

۳ - یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو اطلاع ملی کہ باغیوں میں سے جو لوگ نیپال میں داخل ہُوئے ان میں حضرت محل اور نانا بھی شامل تھے[۴]

نانا کی باقی عمر نیپال ہی میں گزری۔ مختلف لوگوں نے بیان کیا کہ اُنھوں نے نانا کو دیکھا ہے۔ بعض نے ہندوستان میں آنے کی اطلاعات بھی دیں لیکن کوئی مستند نہ مل سکی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ نانا نے فقیری اور درویشی اختیار کر لی تھی اور

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۵۷۔ [۲] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۵۲۹، [۳] ایضاً صفحہ ۵۳۳۔ [۴] ایضاً صفحہ ۵۳۸۔

چند ساتھی ان کے ہمراہ رہ گئے تھے۔

اہل و عیال

معلوم نہیں نانا نے کتنی شادیاں کیں۔ اس کی ایک بیٹی مینا کا ذکر بعض کتابوں میں دیکھا ہے۔ چار کنیزیں تھیں یعنی تاج بی بی، چندر خانم، گیتی افروز، حسینی خانم۔ حسینی کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے وقت اس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔

وضع و عادات

ٹریویلین نے نانا کو اٹھائیس سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ چالیس کا معلوم ہوتا ہے، جس میں فربہی کے آثار نمایاں تھے۔ چہرہ گول، آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی، ان میں شیر کی آنکھوں کی سی چمک اور بے تابی نمایاں تھی۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسا اہلِ ہسپانیہ کا ہوتا ہے، بات چیت میں مزاح کی جھلک پائی جاتی تھی۔ ڈاڑھی منڈواتے تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ڈاڑھی چھوڑ دی تھی۔ جتنی تصویریں نظر سے گزریں، ان میں ڈاڑھی تھی۔ ساور کر نے لکھا ہے کہ نانا دربار کے موقع پر کمخواب کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایسے بیش بہا جواہرات تھے، جنہیں دیکھ کر انگریز سراپا مدح و ستائش بن جاتے تھے۔ طبیعت میں سخاوت تھی اور دل ہمدردی سے لبریز۔ لوگ اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انگریزوں نے واقعاتِ قتل کے باعث سب سے بڑھ کر اس کی مذمت کی ہے۔

بالا صاحب اور راؤ صاحب

بالا راؤ بھی نانا کے ساتھ نیپال چلا گیا تھا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ وہ ۱۸۵۹ء میں معافی مانگ کر واپس آنے کے لیے تیار تھا اور کہتا تھا کہ کان پور کے واقعاتِ قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے بہت جلد وفات پائی۔

نانا کا بھتیجا راؤ صاحب مختلف مقامات پر لڑا۔ پھر وہ وسط ہند میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ بالآخر بھیس بدل کر سرحدی پہاڑوں میں پھرنے لگا، ۱۸۶۲ء میں گرفتار ہوا۔ یاتریوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ کان پور میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی کہ اس کے خلاف بغاوت کی انگیخت، بغاوت کی قیادت اور انگریزوں کے قتل میں اعانت کے الزامات ثابت ہو گئے تھے۔ ۲۰ اگست ۱۸۶۲ء کو اُسے کان پور میں پھانسی دی گئی۔

جنرل بخت خاں

ابتدائی حالات جنرل بخت خاں کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم نہ ہو سکے۔ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اس کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا اور اسے نجیب الدولہ اور روہیلہ کے خاندان سے قرابت قریب تھی۔ اس خاندان پر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں اور پوتے غلام قادر خاں دونوں کے عہد میں گردش کا دور آیا۔ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کب؟ لیکن ایسے ہی کسی ناسازگار وقت میں خاندان کے افراد بکھرے تو عبداللہ خاں نے اودھ کے ایک ضلع سلطان پور میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ بڑا وجیہہ اور خوشرو تھا اور بہادری میں بھی یگانہ مانا جاتا تھا۔ غالباً انھیں اوصاف کی بنا پر شجاع الدولہ والیِ اودھ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس طرح پریشان روزگار عبداللہ خاں کا رشتہ والیانِ اودھ کے خاندان سے استوار ہو گیا۔[1]

بخت خاں کا بیان منشی جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۱۔ مارچ ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> بخت خاں نے بادشاہ (بہادر شاہ) کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرما لی جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً شریف و نجیب خاندان میں سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا، میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی، آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو میں اعزاز کے کسی امتیازی نشان کے لیے استدعا کروں گا۔[2]

[1] حیات علامہ فضل حق خیرآبادی بحوالہ بہادر شاہ ظفر صفحہ ۲۳۸ ؂ دور روزنامچہ (انگریزی) صفحہ ۱۴۶

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ جیون لال کے بیان کے مطابق بخت خاں نے خود بادشاہِ دہلی کا ہم خاندان ہونے کا بھی ذکر کیا۔[1]

انگریزی فوج میں ملازمت

تمام روایتیں متفق ہیں کہ بخت خاں نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ وجہ خواہ یہ ہو کہ اس کی بے چین اور عزیمت درست طبیعت سکون کی زندگی بسر کرنے پر راضی نہ تھی، خواہ یہ ہو کہ جو جاگیر اس کے خاندان کو حاصل تھی، وہ گذارے کے لیے کافی نہ تھی۔ البتہ ایک امر غور طلب ہے اور وہ یہ کہ جب اودھ کے فرمانرواؤں سے قرابت کا علاقہ تھا اور اودھ میں اچھی فوجی ملازمتوں کی کمی نہ تھی تو بخت خاں نے انگریزی ملازمت کو کیوں ترجیح دی؟ کیا اودھ کے فرمانرواؤں سے رشتہ داری ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی کہ وہ بخت خاں کی سرپرستی پر آمادہ نہ ہوئے یا کیا بخت خاں کا والد پہلے سے انگریزی فوج میں ملازم تھا اور بیٹے نے بھی اسی کو پسند کیا یا کیا بخت خاں کو انگریزی فوج میں ملازم ہو کر نئے فنون جنگ سیکھنے کے مواقع زیادہ نظر آئے، جو اودھ کی ملازمت میں میسر نہ آسکتے تھے؟

اِن سوالات کا کوئی قطعی جواب ہمارے سامنے موجود نہیں اور ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ بخت خاں نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

توپ خانے کا اعزاز

وہ پہلی جنگِ افغانستان میں جنرل سیل کی فوج کے ہمراہ تھا اور اس وقت توپخانے ہی کا افسر تھا۔ رکٹس[2] نے لکھا ہے:

> بخت خاں توپخانے کی میدانی بائٹری کا سب سے بڑا دیسی افسر تھا اور اس بائٹری کے تمام توپچی دیسی تھے۔ یہ بائٹری خاصی مشہور تھی، کیونکہ اس نے پہلی جنگ افغانستان میں جنرل سیل کے ماتحت بمقام جلال آباد اہم خدمات انجام دی تھیں اور اس کی توپوں پر بطور امتیاز پھولوں کا تاج بنا ہوا تھا۔[3]

ظاہر ہے کہ جس بائٹری کو امتیاز کے طور پر ایک خاص نشان بنوا لینے کی اجازت دے دی گئی تھی، وہ یقیناً خاص حیثیت کی مالک ہوگی۔ باقی لوگوں نے بخت خاں کو توپخانے کا صوبیدار لکھا ہے اور ہومز کہتا

---

[1] دو روز نامچے (انگریزی) صفحہ ۴۶ ۱۰ [2] RICKETTS [3] دو روز نامچے (انگریزی) صفحہ ۱۳۳ حاشیہ بربنائے بیان رکٹس۔

ہے کہ وہ بڑا قابل اور ہوشیار صوبیدار تھا۔[۱]

نیمچ اور بریلی

افغانستان سے مراجعت کے بعد بخت خاں نیمچ میں رہا، جو گوالیار کی مشہور چھاؤنی ہے۔ پھر کچھ معلوم نہیں کہ کہاں کہاں منتقل ہوا۔ البتہ میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہوا تھا تو وہ بریلی میں مقیم تھا۔[۲]

ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سپاہ میں بے چینی کے آغاز پر توپخانے کو انگریز اپنی تحویل میں لے لینا چاہتے تھے جس شخص نے زور دے کر احتجاج کیں اور بڑے بڑے افسروں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں، وہ بخت خاں ہی تھا جو سرکشی کے بعد بریلی کے برگیڈ کا کمانڈر بنا اور دہلی پہنچا تو اسے سپہ سالار اعظم بنا دیا گیا۔[۳]

افکار میں تبدیلی

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کے افکار و عزائم پہلے وہ نہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولوی سرفراز علی کے حکم کی بناء پر انگریزوں سے بیزار ہو گیا۔[۴] افسوس کہ مفتی صاحب نے اس کی تفصیل بیان نہ فرمائی یعنی یہ کہ مولوی سرفراز علی کون تھے؟ بخت خاں نے کہاں ان کی بیعت کی؟ انھوں نے کیا حکم دیا تھا اور کیا کہہ کر اُس کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبہ پیدا کیا تھا۔

ہمیں مولوی سرفراز علی کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ ان کا ذکر یقیناً مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار و مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا۔[۵]

بالکل یہی مضمون حکیم احسن اللہ خاں کے اس بیان میں درج ہے جو بہادر شاہ کے مقدمے میں دیا گیا تھا۔

۱۔ ہومز صفحہ ۲۴۲ ۲۔ میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۰۲ ۳۔ ایضاً صفحہ ۲۰۳ ۴۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۲۷
۵۔ میلی سن جلد سوم صفحہ ۲۰۳

میرا احساس یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ لکھا، حکیم احسن اللہ خاں کے بیان ہی سے ماخوذ ہے اور حکیم صاحب کا درجہ طبابت یا بعض دوسرے علوم میں کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کی دینی معلومات بہت ہی عامیانہ سی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے "وہابی" کا لفظ ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا، جو سیّد احمد شہید کے مسلک پر کاربند تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی اسلامی سرزمین کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے تو مسلمانوں پر جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اسی بناء پر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے سرگرم داعی تھے۔ اسی لیے حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا کہ بخت خاں خود "وہابی" تھا جیسا کہ محمد غوث خاں اور مولوی امام خاں "وہابی" تھے۔ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے۔[1] اگر سیّد صاحب سے ان کا تعلق نہ تھا تو کم از کم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ وہ جہاد کو بھی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح اسلام کے ارکان میں سے سمجھتے تھے اور اس پر عمل ضروری جانتے تھے۔ بعض بیانات میں مولوی سرفراز علی کو جون پوری بتایا گیا ہے، لیکن ان کے حالات نہیں بتائے گئے

بریلی میں پرچم آزادی

بریلی میں بے چینی تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی، جب میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات میں ہنگامے کے آغاز کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ۳۱- مئی ۱۸۵۷ء کو حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ہنگامہ کی ابتدا آتش زنی سے ہوئی۔ مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں (ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ رحمت خاں) محمد شفیع اور بخت خاں اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ اعلان آزادی کے بعد خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کی حکومت سونپ دی گئی، اوّل اس لیے کہ روہیل کھنڈ میں پہلے انھیں کے خاندان کی حکومت تھی اور وہاں اعزاز و اکرام کا جو درجہ انھیں حاصل تھا، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خان بہادر خاں مدت العمر ذمہ داری کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد پنشن لے چکے تھے اور انھیں ملک داری کے معاملات کا خاصا تجربہ تھا۔

ایک شبہ

میلی سن کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں کو غالباً بخت خاں کے متعلق منصب حکومت کی دعوے داری کا شبہ تھا، لہٰذا اسے آمادہ کیا گیا کہ فوج لے کر دہلی چلا جائے اور خان بہادر خاں نے خود بھی ساتھ جانے پر مستعدی کا اظہار کیا بلکہ ایک منزل تک ساتھ بھی دیا۔ پھر

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) صفحہ ۲۸۲۔

مراجعت کی۔[1]

یہ شبہ بالکل بے سروپا ہے۔ دہلی جانے کا فیصلہ یقیناً اس بناء پر ہوا ہوگا کہ مجاہدین آزادی کا اصل مرکز دہلی میں تھا اور وہاں کی پوزیشن انگریزوں کے مقابلے میں حد درجہ مستحکم رہنی چاہیے تھی۔ اگر دہلی کو انگریزوں کے مقابلے میں محفوظ رکھا جا سکتا تو دوسرے مقامات کے مجاہدین زیادہ سے زیادہ سرگرمی سے کام کرتے لیکن اگر دہلی کا مرکز چھن جاتا، تو دوسرے مقامات پر بھی یقیناً افسردگی طاری ہو جاتی جیسا کہ ہوئی۔ یہاں رقابت کا کوئی سوال نہ تھا، اس لیے کہ نہ بخت خاں روہیل کھنڈ کی ریاست کا مدعی تھا۔ نہ اس نے بعد کے دور میں کسی جگہ کی حکومت طلب کی۔ نہ عہدے اور منصب سے وہ کبھی متاثر ہوا۔ جس حیثیت میں بھی کام کا موقع ملا، برابر اس میں لگا رہا۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ خان بہادر خاں سے اس کے تعلقات آخری دم تک حد درجہ خوش گوار رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہر معاملے کو اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے اور مجاہدین آزادی میں سے بہت ہی کم لوگ ہیں جن کے متعلق انھوں نے کہیں حسن ظن سے کام لیا ہو۔

دہلی میں ورود

میلی سن نے لکھا ہے کہ روہیل کھنڈ یا بریلی کا بریگیڈ (جیسا کہ بخت خاں کا بریگیڈ مشہور تھا) یکم اور ۲۔ جولائی کو دہلی میں داخل ہوا اور اس میں مندرجہ ذیل رجمنٹیں شامل تھیں!

۱۔ ۱۸ء پیادہ
۲۔ ۲۸ء "
۳۔ ۲۹ء "
۴۔ ۶۸ء "
۵۔ ۸ء بے قاعدہ رسالہ
۶۔ ۱۵ء گھوڑا باٹری
۷۔ دو چھ پونڈ کے گولے والی توپیں[2]

جیون لال کے روزنامچے میں یکم جولائی کے حالات کے ماتحت درج ہے:

محل میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آ پہنچی ہے۔[3]

---

[1] میلی سن جلد سوم صفحہ ۲۰۳ ٭ [2] ایضاً جلد دوم صفحہ ۴۲۵ حاشیہ ٭ [3] دو روزنامچے انگریزی صفحہ ۱۳۲ خواجہ حسن نظامی نے ان روزنامچوں کا جو ترجمہ "غدر کی صبح و شام" کے نام سے چھاپا تھا اس میں یہ موجود نہیں۔ غالباً اتفاقیہ ترجمہ نظر انداز ہو گیا۔

چونکہ پُل خراب ہو چکا تھا اور اس پر سے گزر کی کوئی صورت نہ تھی لہٰذا بادشاہ نے چار سو قلیوں اور سفر مینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی کی سرکردگی میں پُل کی درستی کے لیے بھیج دیا۔ اس اثناء میں دوربین کے ذریعے سے بریلی کی فوج کا معائنہ کیا فوج کے ہاتھیوں اور رسالے کے متعلق اظہار رائے بھی فرمایا۔ پھر معلوم ہوا کہ:

> صبح تک پُل پر سے بریلی کی فوج گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔[1]

بادشاہ سے ملاقات

۲۔ جولائی کے حالات میں مرقوم ہے کہ نواب احمد قلی خاں فوج بریلی کے استقبال کی غرض سے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں، جنرل صمد خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی موجود تھے۔ احمد قلی خاں اور بخت خاں نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج کو متعین کر دیا جائے۔

بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ لُوٹا جائے۔ اس موقع پر فرمایا:

> میرے احکام حاصل کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ ان احکام کی تعمیل تو ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انھیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجایش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ سپہ سالار کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے نشان مودت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات قبول فرمالی ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے۔ سب نے بخت خاں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھایا۔

منصب سالاری

پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے داروغہ کو حکم ملا کہ کالا محل[2]

---

[1] دو روزنامچے صفحہ ۱۳۲-۱۳۳۔ تھیوفلس مٹکاف نے اردو روزنامچوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے وقت ناموں کے متعلق متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں مثلاً یہاں "محمد قلی خاں" نام لکھا تھا حالانکہ یہ نواب احمد قلی خاں تھے یعنی زینت محل کے والد اور بہادر شاہ کے خسر۔

[2] اصل نام "کلاں محل" تھا اور عام لوگ اسے کالا محل کہتے تھے۔

بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں نے شہزادہ میرزا مغل سے ملاقات کی۔

محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر اعظم بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ میرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کی کوشش کی تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ بادشاہ نے فرمایا: تمھیں پورا اختیار ہے جس کام میں بہتری نظر آئے، وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اگر اب لوٹ مار ہوئی تو تمھیں پھانسی دے دی جائے گی۔[1]

بہادر شاہ کے ایک فرمان سے مترشح ہوتا ہے کہ بخت خاں کو "معز الدولہ" کا خطاب بھی ملا تھا۔[2] ایک بیان یہ ہے کہ اسے "فرزند" کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔[3]

فوج کی کیفیت

خود بخت خاں نے فوج کی جو کیفیت بتائی وہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ چار پیادہ رجمنٹیں۔

۲۔ سات سو سوار۔

۳۔ چھ اسپ سوار توپیں۔

۴۔ تین میدانی توپیں۔

۵۔ چودہ ہاتھی۔

۶۔ تین سو کوتل گھوڑے جو نابر کے اصطبل سے حاصل کیے گئے تھے۔

۷۔ ایک سو مجاہدین جنھیں بعض لوگوں نے علماء قرار دیا ہے۔

یہ بھی بتایا کہ میں نے فوج میں چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی تقسیم کر دی ہے اور چار لاکھ روپے نقد ساتھ لایا ہوں۔ غرض میں بادشاہ سلامت کو کسی امداد کے لیے تکلیف نہ دوں گا۔ اگر مجھے کامیابی حاصل ہوئی تو مال غنیمت

---

[1] دو روزنامچے صفحہ ۱۳۴۔۱۳۵ ٭ [2] بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی صفحہ ۶۸ ٭ [3] دو روزنامچے صفحہ ۱۳۸

خزانۂ عامرہ میں داخل کر دوں گا۔ بادشاہ نے فوج بریلی کی ضیافت کے لیے چار ہزار روپے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔[1]

سید ظہیر دہلوی فرماتے ہیں کہ بخت خاں چودہ ہزار کا کمپو، چند توپ خانے، دو تین رجمنٹیں سواروں کی اور کئی لاکھ روپے خزانہ بریلی سے لے کر دہلی پہنچا۔[2]

میرا خیال ہے کہ فوج کی تعداد زیادہ بیان ہوئی ہے۔ سید ظہیر کو یہی اطلاع ملی ہوگی

ہومز کا بیان

ہومز نے لکھا ہے کہ اگرچہ پے درپے امتناعی احکام جاری ہوتے رہے تھے، لیکن شہر میں لوٹ مار جاری تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ بادشاہ کے پاس روپیہ نہ تھا جو سپاہیوں میں تقسیم ہوتا رہتا اور وہ اپنی مزدوریوں کے باب میں مطمئن ہو جاتے۔ مجبور ہو کر وہ شہریوں کو لوٹتے تھے۔

> آخر توپخانے کا ایک ہوشیار صوبیدار مسمی بخت خاں بریلی کی فوج کے ساتھ پہنچا اور بادشاہ کی عنایت سے فوج کی کمان سنبھال لی۔ بادشاہ میرزا مغل کے مغرورانہ ومتکبرانہ طرزِ عمل سے بہت خفا تھا۔ بخت خاں نے بے لگام سپاہ کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوششیں کیں، لیکن وہ غریب تائید وحمایت کے بغیر کیا کر سکتا تھا؟[3]

مُہر کی تیاری

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے بخت خاں کے لیے ایک مُہر بھی تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس زمانے میں بدرالدین علی خاں دہلی میں بہترین مُہرکن تھا۔ ۷۔ اگست کو اس کے نام حکم جاری ہُوا:

> تمھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ہمارے مُشیرِ سلطنت کے لیے ایک مُہر تیار کر کے پیش کرو جس کی وضع قطع بھی بہت عمدہ ہو اور اس کی تیاری میں بھی حسن وخوبی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ اس میں موصٰی الیہ کے تمام خطابات درج ہوں۔ یعنی "معز الدولہ، عابد دولت کا بندۂ خاص محمد بخت خاں لارڈ گورنر بہادر، ناظم جملہ امور فوجی و دیوانی"۔ دستور کے مطابق اس میں اکیس سن جلوس درج کیا جائے۔[4]

---

[1] روزنامچہ صفحہ ۱۳۵ ؛ [2] "داستانِ غدر" صفحہ ۹۷ ؛ [3] ہومز صفحہ ۳۴۲-۳۴۳ ؛ [4] بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی صفحہ ۳۱ ؛

انگریزوں سے پہلی جنگ

بخت خاں نے دہلی پہنچتے ہی انگریزی فوج کے ساتھ زبردست جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں ہنری برنارڈ انگریزی فوج کا کمانڈار تھا اور اس نے ۲ یا ۳ جولائی کو شہر پر حملے کی ایک سکیم بنائی تھی۔ وہ اس وجہ سے ملتوی کرنی پڑی کہ اطلاع مل گئی تھی خود انگریزی فوج پر ایک زبردست حملہ ہونے والا ہے۔ نیز ایک پلٹن میں بغاوت کے کچھ آثار نمودار ہو گئے تھے۔

بخت خاں نے فیصلہ کیا تھا کہ حملہ ۳۔جولائی کی صبح کو ہو۔ اس سے جنرل موصوف کی مستعدی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ طویل سفر کے بعد ۲۔جولائی کو دہلی پہنچا تھا اور قیام کے انتظامات نیز بعض مشوروں میں خاصا وقت صرف ہوا۔ تاہم اس نے کارروائی کے آغاز میں غیر ضروری توقف روا نہ رکھا۔

افسوس کہ ہمیں اس حملے کی تفصیلات دیسی ذرائع سے نہ مل سکیں اور جو کچھ یہاں درج کیا جا رہا ہے وہ صرف انگریزوں کی اطلاعات پر مبنی ہے جنھیں یقینی طور پر درست ماننا اس وقت تک مشکل ہے جب تک کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہ ہو جائے۔

انگریزی بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ حملہ ۳۔جولائی کی صبح کے بجائے ۳۔اور ۴۔کی درمیانی شب میں ہُوا۔ بخت خاں کا جیش، جس میں سوار، پیادے اور توپخانے والے کل چار پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر علی پور کی طرف بڑھا۔ گویا اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں پر پیچھے سے حملہ کرے۔ اس اثنا میں زخمیوں کا ایک قافلہ انبالہ بھیجا جا رہا تھا، نیز فیروز پور سے سامانِ جنگ اور نقد روپیہ آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں قافلوں پر حملہ کرنا مقصود ہو۔

عمومی کیفیت

میجر کوک[۱] کو فوج دے کر مقابلے پر بھیجا گیا۔ اس فوج میں پیادے بھی تھے، سوار بھی اور توپخانہ بھی۔ میجر کوک کے نام کی دھاک بھی خاصی بیٹھی ہوئی تھی لیکن :

> نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ زمین دلدلی ہو رہی تھی، پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی۔ ہم بڑی تاخیر سے کام شروع کر سکے۔
>
> ۴۔جولائی کو صبح کے وقت ہمارے کالم نے سپاہیوں کی رجمنٹیں دیکھیں جب وہ علی پور سے واپس آ رہی تھیں۔ ہماری توپوں کی گولہ باری

---

[۱] سن جلد دوم صفحہ ۴۲۵ - ۴۲۶ +

شروع ہو گئی لیکن کوک نے درمیانی فاصلے کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ
توپوں کا اثر غنیم پر کچھ نہ پڑ سکا اور ہماری پیادہ فوج لڑائی میں حصّہ لینے
کے لیے بروقت نہ پہنچ سکی۔ سپاہیوں کا جرنیل بخت خاں ہمارے قریب
آنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُس نے اپنی فوج کو پیچھے ہٹا کر دہلی کا رُخ کر لیا۔
وہ کچھ سامان بھی پیچھے چھوڑ گیا جو زیادہ تر ان کے مالِ غنیمت پر مشتمل تھا
—— گولی بارود کی گاڑیاں یا چھوٹے کارتوسوں کے چند بورے[1]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ دہلی سے آٹھ دس میل باہر نکل کر حملہ کرنے کے باوجود کیوں زبردست جنگ نہ ہوئی اور کس وجہ سے بخت خاں نے فیصلہ کیے بغیر مراجعت منظور کر لی۔

بعض انگریزی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ گوروں کو آفتاب کی حدت نے سخت پریشان کر دیا تھا۔ وہ درختوں کے سایے میں گر گر جاتے تھے اور انھیں کیمپ میں لانے کے لیے ہاتھی بھیجے پڑے۔ نیز ہاڈسن کہتا ہے کہ اس لڑائی میں تیس چالیس گورے مارے گئے اور میرے تین دیسی افسر عارضی طور پر لڑائی کے ناقابل ہو گئے۔[2]

جیون لال کا بیان

جیون لال کے روزنامچے میں بھی ایک جگہ اس لڑائی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں خود فوج کے ساتھ نہ گیا تھا، صرف دو رجمنٹوں کو بھیج دیا تھا تاکہ انگریزوں کی رسد کے سلسلے کاٹ دیے جائیں۔ وہ دونوں رجمنٹیں سامان کی دو بھری ہوئی گاڑیاں لے کر واپس ہوئیں۔ کشمکش میں پٹیالہ کی فوج کے نو سوار مارے گئے۔ علاوہ بریں ان رجمنٹوں نے علی پور میں توپ خانے کی باڑی قائم کر دی۔ انگریزوں نے رات کے وقت اس پر حملہ کیا جس میں آٹھ سو سپاہیوں کا نقصان ہوا۔

اب سوچیے کہ میلی سن لکھتا ہے، مالِ غنیمت انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ جیون لال نے تصریحاً کہا ہے کہ مالِ غنیمت شہر کے اندر پہنچا۔

ایک اور بیان مظہر ہے کہ بخت خاں نے دس ہزار پیادوں اور رسالے کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کیا۔ بہت سے آدمی اور افسر مارے۔ انگریزوں کے توپخانے نے بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس جنگ میں مجاہدین بھی ساتھ تھے۔ جب انگریزی توپوں کا رُخ حملہ آوروں کی طرف ہوا تو وہ شہر کی طرف پلٹ گئے۔

دہلی میں انتظامات

بخت خاں کے پہنچنے سے پیشتر دہلی کے حالات بڑے ابتر تھے۔ بہادر شاہ اتنا

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۴۲۵-۴۲۶ [2] ایضاً صفحہ ۴۲۶ حاشیہ۔

بوڑھا ہو چکا تھا کہ وہ کوئی کام خود دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ شہزادوں میں میرزا مغل، میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر تمام معاملات کی باگ ڈور سنبھالے بیٹھے تھے، انھیں انتظام کا کوئی بھی سلیقہ نہ تھا۔ جن آدمیوں نے ان کی حاشیہ نشینی اختیار کر لی تھی، وہ بھی حالات سے عموماً ناواقف تھے اور خوشامد یا احمقانہ خیال آرائیوں کے سوا اُن کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ بخت خاں نے سپہ سالار اعظم بنتے ہی درستی احوال کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ افسوس کہ شہزادوں کی مداخلت اور ان کے مشیروں کی خود غرضیوں کے باعث مقصد پورا نہ ہو سکا، یہاں تک کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بخت خاں کی مساعی اصلاح کا سرسری مرقع یہ ہے:

۱- دربار دہلی کی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ بخت خاں نے جہاں لوٹ مار بند کی۔ نظم قائم کیا، وہاں ساہوکاروں اور سیٹھوں کے ذریعے سے روپیہ قرض لینے کے لیے بھی تدبیریں اختیار کیں۔ اس کے حوالے منشی جیون لال کے روزنامچے میں جا بجا ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ نے بھی اپنے ملازموں کی تنخواہوں کا انتظام اس کے ذمے لگا دیا تھا۔[1]

۲- اُس نے منادی کرا دی کہ تمام دوکاندار اپنے پاس ہتھیار رکھیں جس کے پاس ہتھیار نہ ہوں وہ مفت سرکار سے لے جائے۔ جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ جس کے پاس کوئی بارود ہو، وہ میگزین کے حوالے کر دے، ورنہ سزا پائے گا۔[2]

۳- شہر میں چینی اور نمک کی درآمد پر محصول لگا دیا گیا تھا۔ بخت خاں نے اسے موقوف کرایا اور کہا کہ محصول باقی رہا تو ان جنسوں کی درآمد رک جائے گی۔ عوام بھی تکلیف اٹھائیں گے اور فوج بھی پریشان ہو گی۔[3]

۴- جس شخص پر انگریزوں کی طرفداری کرنے یا انھیں چھپانے کا الزام لگتا تھا، اس کے گھر پر سب چڑھ دوڑتے تھے۔ چنانچہ نواب جھجر کے ایک ہندو داروغہ پر ایسا ہی الزام لگا اور لوگوں نے اس کی پچاس ہزار کی جائیداد لوٹ لی۔ بخت خاں کو پتہ چلا تو سپاہی اس ظلم کی روک تھام کے لیے بھیج دیے۔[4]

۵- بخت خاں کی ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر اس نے شہر میں ذبیحہ گاؤ بند کرا دیا تھا۔[5]

۶- بخت خاں نے مختلف راجاؤں اور والیان ریاست سے بھی خط و کتابت کا انتظام کیا تھا اور بعض کی

---

[1] روزنامچے صفحہ ۱۳۶ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۳۵ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۵۲ ۔ [4] ایضاً صفحہ ۱۶۶ ۔

[5] ایضاً صفحہ ۱۷۰ ۔

عرضداشتیں اسی کے ذریعے سے دربار میں پیش ہوئی تھیں۔

اختلافات اور رقابتیں

افسوس کہ شہزادوں کو بخت خاں کی یہ کارکردگی اور یہ عزت ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے مختلف ذریعوں سے دراندازیاں شروع کر دیں۔ ان کے خاص کارندوں نے شکایتیں کیں کہ ہمیں بخت کی قیادت منظور نہیں۔ میرزا مغل ہی کو ہم اس بڑے اعزاز کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پھر یہ کہا گیا کہ جب تک بخت خاں نہیں آیا تھا، انگریزوں سے روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں اور جب سے بخت خاں نے دہلی میں قدم رکھا ہے لڑائیاں بالکل بند ہو گئیں۔ یہ الزام سراسر غلط تھا، اس لیے کہ ابتدا میں انگریزی فوج بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس ساز و سامان بھی کم تھا۔ اس کے تمام مورچے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد اور ساز و سامان کی مقدار ترقی پذیر رہی۔ یقیناً انگریزوں پر حملہ جتنا آسان ابتدائی دور میں تھا، اتنا آخری دَور میں نہ تھا، بایں ہمہ لڑائیاں برابر ہوتی رہیں۔

خود میرزا مغل نے بھی بخت خاں کے خلاف شکایات میں تامّل نہ کیا۔ مثلاً اُس نے ایک عرضداشت لکھی کہ پہلے قرضے کے انتظام کا حکم مجھے دیا گیا تھا۔ اب بخت خاں کو مختار بنا دیا گیا ہے۔ مناسب ہے کہ حضور بخت خاں کو روک دیں۔ مَیں قرض کا انتظام کر چکا ہوں۔[1]

فوج کی تقسیم

ان جھگڑوں اور شکایتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ نے فوج کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حِصّے کی سالاری میرزا مغل کو دے دی۔ دوسرے کی بخت خاں کو اور تیسرا حصّہ غالباً میرزا ابوبکر کے حوالے کیا۔ یہ تفریق و تقسیم احوالِ جنگ پر ہرگز اچھا اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ انگریزوں نے دہلی کے خلاف خاصی بڑی قوّت فراہم کر لی تھی، اس کے مقابلے کے لیے مجاہدین میں اتحاد و اتفاق حد درجہ لازم تھا۔ افسوس کہ شہزادوں نے اس کا کوئی موقع نہ چھوڑا۔ پھر لطف یہ کہ وہ نہ فنونِ جنگ سے آگاہ تھے، نہ انھیں اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کا کوئی صحیح تصور تھا اور نہ یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اس رعایا کی دلداری اور تالیفِ قلوب کی مناسب تدابیر اختیار کر سکتے ہیں، جن کے بغیر وہ کسی کو ساتھ ملا ہی نہ سکتے تھے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ بخت خاں نے خود کہہ دیا تھا کہ میں صرف اپنی فوج کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں، باقی سے مجھے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

---

[1] مقدمہ۔ بہادر شاہ انگریزی صفحہ ۶۶ +

حقیقت کچھ ہو، ایک طرف حالات ناسازگار ہوتے گئے، دوسری طرف دہلی کے اندرونی نظم ونسق میں تفرقے کی کارفرمائی بڑھ گئی۔

انگریزوں کے خلاف منصوبے اس دور میں بھی بخت خاں کا دماغ انگریزوں کے خلاف منصوبے سوچنے میں لگا رہا۔ منشی جیون لال نے ۴۔ اگست کے حالات میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کوئی ڈیڑھ سو فوجی افسر بلائے اور ان سے کہا کہ میں نے میرزا مغل اور جنرل بخت خاں کو فوجوں کی قیادت کے لیے تجویز کیا ہے۔ تمھیں ان میں سے جو پسند ہو، اُسے منتخب کر لو۔ ہمارے لشکری ہر وقت بڑ ہانکتے رہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن لڑتے نہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ انگریز دہلی لے لیں گے۔ اور مجھے قتل کر دیں گے۔ افسر اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہم جانیں لڑا دیں گے۔ بخت خاں نے کہا: اب خدا کے فضل سے میں ضرور کامیابی حاصل کروں گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ انگریزوں پر علی پور کی جانب سے حملہ کروں۔[1]

گویا دہلی کی محاصر انگریز فوج کا تعلق پنجاب، انبالہ اور فیروزپور سے توڑنے کے لیے بخت خاں آخری وقت تک سرگرم رہا۔

۵۔ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ بخت خاں میگزین کو شہر سے باہر لے جانا چاہتا تھا اور اس نے چالیس توپوں کے لیے دمدمے بنانے کا انتظام شروع کر رکھا تھا۔[2]

انتظام جہاد بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی ایک مرتبہ بعض علماء نے جامع مسجد میں جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ بخت خاں نے تمام علماء کو جمع کر کے کہا کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ یہ فتوے جاری ہوا۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا ہو۔ سرسید نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی فتوے حقیقتاً موجود نہ تھا اور بعض علماء کے دستخط بنا لیے گئے تھے۔ نیز جن علماء کے دستخط فتوے پر چھپے تھے، ان میں سے بعض نے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔

ممکن ہے یہ رائے درست ہو لیکن اعلان جہاد کے بعد کسی پناہ گیر کی جان بچانا اور اس کی حفاظت

---

[1] دو روزنامچے صفحہ ۱۸۱۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۲۲۔

کرنا عین واجب ہے۔ اس میں تضاد کیا ہے؟ جہاد انھیں وگوں سے ہے جو منظم جنگ کریں، باقی کسی کو چھیڑنا ہرگز جائز نہیں۔

بہ ہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ایک فتوے ضرور تیار ہؤا تھا۔ وہی فتویٰ تھا جس پر دستخط کرنے کے باعث مفتی صدرالدین آزردہ کی جایداد ضبط ہوئی تھی اور انھوں نے "کتبت بالخیر" کو "کتبت بالجبر" قرار دے کر جان بچائی تھی۔ اسی فتوے پر دستخط کرنے کے باعث مولانا فضل حق خیرآبادی پر مقدمہ چلا تھا۔

دہلی سے روانگی

جب انگریز دہلی میں داخل ہو گئے تو عزیمت دوست بخت خاں نے اپنی فوج فراہم کی اور بادشاہ سے بہ منت کہا کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلے چلیں۔ یہ بھی کہا کہ میں دہلی سے باہر تمام سپاہیوں کو اکٹھا کر کے پھر انگریزوں سے لڑوں گا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں لکھنؤ چلا گیا۔[1]

میلی سن کا بیان

میلی سن نے تصریحاً لکھا ہے کہ بخت خاں ۱۹ ستمبر کو دہلی سے روانہ ہؤا تھا۔ اس نے تمام جنگ آزماؤں کو ساتھ لے لیا تھا، جن پر اُسے پُورا بھروسہ تھا۔ اس وقت دہلی دروازے اور خیراتی دروازے سے لوگ باہر جا سکتے تھے۔ اور جمنا کے پُل سے بے تکلف گزر سکتے تھے:

> بخت خاں نے بادشاہ کو ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے پُورا زورِ کلام صرف کر دیا۔ اُس نے کہا کہ سب کچھ ضائع نہیں ہؤا۔ بیشک انگریز شہر پر قابض ہو گئے ہیں اور قلعہ انھوں نے لے لیا ہے، لیکن ملک ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ بادشاہ کے نام اور وجود کے سایے میں جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے اور کامیابی کے امکانات بھی موجود ہیں۔[2]

غرض وہ بہادر شاہ کی طرف سے مایوس ہو کر ۱۹ ستمبر کو نکلا اور ولیم میور نے فوجی اطلاعات کا جو مجموعہ شائع کرا دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بدایوں ہوتا ہؤا ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد پہنچا۔ گویا دہلی سے فرخ آباد پہنچنے میں ایک مہینے سے زیادہ مدت صرف ہو گئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں کہاں ٹھیرا، کیا کیا کاروائیاں کیں اور زیادہ وقت کس مقام پر گزارا؟

---

[1] دو روزنامچے صفحہ ۷۰ ۔ [2] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۵۰ ۔

لکھنؤ میں سرگرمیاں لکھنؤ پہنچنے کے بعد بخت خاں کی سرگرمیوں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ وہ اوائل نومبر میں لکھنؤ وارد ہو گیا ہوگا اور آئندہ فروری تک یقیناً وہیں رہا۔ مختلف لڑائیوں میں اس کی شرکت ثابت ہے۔ ایک موقعے پر اس کی کچھ توپیں چھن گئیں تو بہت غمگین ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا، رنج نہ کرو، ہیں اور توپیں دوں گی۔[1] کہا جاتا ہے کہ حضرت محل نے بخت خاں کو خلعت اور رومال بھی عطا کیا تھا۔[2] نیز وہ پانچ ہزار فوج ساتھ لے گیا تھا۔ دہلی اور فرخ آباد کے بہت سے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور تین سو عورتیں بھی اس کے قافلے میں شامل تھیں۔

آخری دور جب لکھنؤ پر بھی انگریز قابض ہو گئے تو بخت خاں مولانا احمد اللہ شاہ کے ہمراہ شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا۔ پھر وہ محمدی ہوتا ہوا نیپال میں داخل ہو گیا۔ باقی عمر وہیں گزاری لیکن یقینی طور پر کسی کو معلوم نہیں کہ کس حالت میں گزاری اور کب وفات پائی۔

بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ وہ سرحد آزاد میں پہنچ گیا تھا لیکن میرے نزدیک یہ بیان صحیح نہیں۔ رکٹس رقمطراز ہے :

> غدر کے اختتام پر بخت خاں کی بڑی جستجو کی گئی لیکن وہ کہیں نہ ملا نہ اس کے متعلق کچھ سنا۔ یہ یقینی ہے کہ وہ کسی لڑائی میں مارا نہ گیا۔ ایسا ہوتا تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔ ایک دو توپیں بھی نہ مل سکیں۔[3]

سچے مجاہد کی زندگی بخت خاں نے زندگی انتہائی سادگی میں گزاری۔ خصوصاً راہِ جہاد میں قدم رکھنے کے بعد ایسا لباس اختیار کر لیا تھا کہ اس میں اور عام سپاہیوں میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ سید ظہیر دہلوی نے اسے دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں :

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۲ ۔

[2] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۷۵-۷۶۔ مفتی انتظام اللہ کا بیان نظرثانی کا محتاج ہے کہ بخت خاں جب لکھنؤ پہنچا تو سلطان بہو بیگم خلد منزل کے پاس بہ سبب قرابت قریب ٹھہرا تھا۔ قیصر التواریخ جلد دوم سے واضح ہے کہ یہ بخت خاں کا ذکر نہیں، شہزادہ فیروز شاہ کا ذکر ہے انھیں سلطان بہو سے قرابت قریبہ تھی اور اسی کے لیے حضرت محل نے پانچ ہزار روپے بہ طور ضیافت بھیجے تھے۔

[3] دو روزنامچے صفحہ ۱۳۳ حاشیہ۔ مطلب یہ ہے کہ بخت خاں توپیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

سر پر انگوچھا لپٹا ہُوا۔ کرچ گلے میں پڑی ہوئی۔ پیچھے حال کھلا۔
بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ بہ ظاہر تو اُس کا لباس گھس کھدوں کا سا تھا
مَیں تو سمجھا جیسے اور پوربیے سپاہی ہیں۔ یہ بھی کوئی سپاہی ہی
ہوگا۔

پھر اسے توپخانے میں وہ عہدہ حاصل تھا، جو اُس زمانے میں شاید بہت کم لوگوں کو نصیب تھا۔ اگر وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا تو یقیناً مزید اعزاز حاصل کرتا۔ لیکن سلطان فرض کی پُکار نے اسے انتہائی مشقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ انجام کار غربت اختیار کرنی پڑی۔ ستایش کے مستحق وہی ہیں جو اپنے فرض سے بوجہ احسن سرخرو ہوں، اگرچہ راستے میں کتنی ہی مشکلات سے سابقہ پڑے اور گردوپیش مصیبتوں کی کتنی ہی بجلیاں کوندتی پھریں۔ بخت خاں نے فرض ادا کرنے میں قطعاً کوتاہی نہ کی۔ وہ سچّا مجاہد تھا اور مجاہدین کی شان کے ساتھ اِس دنیا سے رخصت ہُوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

شہزادہ فیروز شاہ

حسب و نسب

اِس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ مغلوں کے شاہی خاندان کا ایک معزز رکن تھا، لیکن اُس کے نسب کا معاملہ ذرا تشریح طلب ہے۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ مرزا ناظم بخت کا بیٹا تھا اور فرخ سیر کا نواسا تھا[1] مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ ناظم بخت شاہ عالم ثانی کا فرزند تھا[2]۔

مجھے شاہ عالم ثانی کی پوری اولاد کا نقشہ بہ قید تاریخ ولادت نہ مل سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ شاہ عالم کا بڑا بیٹا مرزا جواں بخت تھا، جو ابتدا میں ولی عہد ہوا۔ اس کی وفات پر دوسرے بیٹے کو ولی عہد بنایا گیا جو معین الدین اکبر شاہ ثانی کے لقب سے ۱۸۰۶ء میں مسند نشین ہوا۔ اکبر شاہ کی تاریخ ولادت ۱۷۵۹ء ہے۔ اس سے ناظم بہر حال بہت چھوٹا ہوگا۔

اب سوچیے کہ فرخ سیر کی وفات ۱۷۱۹ء میں ہوئی۔ اگر اس کی کوئی بیٹی ۱۷۱۹ء میں بھی پیدا ہوتی تو وہ ناظم بخت کی ولادت تک بہت بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ لہٰذا محولہ بالا بیان قابلِ قبول نہیں۔

ہاں، یہ مان سکتے ہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ کا رشتہ والد اور والدہ دونوں جانب سے بہادر شاہ اول ابن عالمگیر اعظم سے ملتا تھا۔ والد کی جانب سے شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی اور جہاندار شاہ کے واسطے سے والدہ فرخ سیر کی کسی بیٹی کی اولاد میں سے ہوگی۔ خود فرخ سیر عظیم الشان ابن بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا۔

تاریخ پیدائش

تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگِ آزادی کے وقت شہزادہ فیروز شاہ نے خوب سرگرمی دکھائی اور اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس اور پچاس کے درمیان ہونی چاہیے۔ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء تک زندہ تھا بلکہ میرے پاس تو ایک ایسی روایت بھی موجود ہے جس میں ۱۹۰۶ء تک اس کا زندہ ہونا بتایا گیا ہے۔ جن صاحب سے شہزادہ ملا تھا، ان کا بیان ہے کہ عمر ستر ۷۰ اور اسی ۸۰ کے درمیان ہوگی۔ اس وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ شہزادہ کی ولادت

[1] جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔
[2] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۳۔

۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ہوئی۔ بے شک یہ محض قیاس ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں خاصی معقول ہیں۔

لکھنؤ سے تعلق آگے چل کر معلوم ہوگا کہ شہزادہ جب جہاد کے سلسلے میں لکھنؤ پہنچا تو وہ قرابت قریبہ کے سبب سلطان بہو کے پاس قیام پذیر ہوا جو امجد علی شاہ کی بیگم تھی لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھی؟ آیا لکھنؤ کے شاہی خاندان میں سے تھی جس سے شہزادے کے والد میرزا ناظم بخت کی قرابت تھی یا وہ مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی تھی جس کی شادی لکھنؤ کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی؟ میں نے صحیح کیفیت دریافت کرنے کی کوشش بہت کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔

ابتدائی حالات شہزادے کے متعلق بتایا گیا ہے کہ والد نے علوم مروجہ اسے بخوبی سکھا دیے تھے، اور فنون حرب کی مشق بھی اس قدر کرا دی تھی کہ وہ تمام فنون میں ماہر ہو گیا تھا۔ یہ چیزیں اس عہد کی تعلیم و تربیت میں شامل تھیں اور شہزادوں کے تعلق میں تو ان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

بعد میں شہزادے نے جس سرگرمی سے جہاد آزادی میں حصہ لیا، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طریق زندگی وقت کے عام شہزادوں کے خلاف خاصا زاہدانہ اور جفاکشانہ تھا۔ اگر وہ بھی دوسرے شہزادوں جیسا ہوتا تو چپ چاپ کہیں بیٹھا رہتا یا کسی لڑائی میں حصہ لیتا تو جوش، ہمت، اور استقامت کے وہ ثبوت پیش نہ کرتا جن کی تفصیل آپ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

سفرِ حج مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ شب و روز اوراد و وظائف کا مشغلہ رہتا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شہزادے نے بالاہتمام حج کیا۔ حالانکہ مغل شہزادوں کا عام طریقہ یہ نہ تھا۔ یقیناً وہ اس سفر میں تنہا نہ گیا ہوگا بلکہ ایک جماعت ساتھ ہوگی۔ اور اس زمانے میں حج کے لیے اتنی سہولتیں میسر نہ تھیں، جتنی کہ ہمارے عہد میں میسر ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادہ ۱۸۵۶ء میں حج کے لیے گیا اور اسی سال اس نے حج کیا جو ۱۱ اگست ۱۸۵۶ء کو ہوا تھا۔ پھر غالباً مدینہ منورہ کی زیارت کرتا ہوا ۱۸۵۷ء میں ہندوستان آیا اور وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں کچرود پہنچا جو مندسور کے قریب ایک مقام ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شہزادہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا اور اسی بندرگاہ پر واپس آیا۔

علمِ جہاد شہزادے کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں آزادی کے لیے جنگ چھڑ چکی تھی اور مختلف مقامات

ہیں معرکے بپا تھے۔ دہلی کا محاصرہ جاری تھا۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ سفر مراجعت میں اندور پہنچا تو:

> خبر ہنگامہ فساد سن کر وہیں ٹھہرا جب حکم سرکار ان کی گرفتاری و قتل کا پہنچا تو بھاگ کر گوالیار آیا۔[1]

اس کا مطلب یہ ہؤا کہ حکومت اسے گرفتار کر کے قتل کر دینے کا انتظام کر چکی تھی اور شہزادے نے جو قدم اٹھایا۔ اس میں مقصد آزادی کے علاوہ مقصد حفظ ذات بھی شامل تھا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ شہزادے جیسا صاحب عزیمت پیش آمدہ حالات میں خاموش نہ بیٹھ سکتا تھا۔ مغربی ہندوستان میں اس کے لیے تنظیم قوائے ملّی کے بڑے اچھے مواقع تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ حکومت کی ظالمانہ روش نے اس کی سرگرمی کے لیے ایک نئے تازیانے کا کام دیا۔

مندسور

مندسور ریاست گوالیار کا ایک مشہور مقام ہے جو اجین سے تقریباً اسّی میل شمال میں واقع ہے یہاں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریاست گوالیار کی بعض سرکش افواج قابض ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ پورے مغربی مالوہ میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ اس مقام پر ادھر اُدھر سے بہت سی فوج ہو گئی تھی۔ یہی فوج تھی جس نے شہزادہ فیروز شاہ کو اپنا قائد و سپہ سالار بنا لیا۔

حالات خاصے نازک تھے۔ مندسور کے آس پاس متعدد مقامات تھے، جہاں سازباز کے رشتے پہنچ چکے تھے۔ ریاست دھار کا نوجوان راجا اور اس کا وزیر رام چندر باپوجی، نیز راجا کی والدہ اور چچا انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ نیمچ اور بعض دوسرے مقامات میں بھی آگ سلگ رہی تھی۔ اگر یہ فوج ترتیب سے بمبئی کی طرف بڑھتی تو اس کے لیے خاصا خطرہ پیدا ہو سکتا۔ اس وقت نانا کی فوج کالپی میں تھی۔ اگر وہ وسط ہند کی طرف پیش قدمی کرتی تو انگریزوں کے لیے اس حصے میں بچاؤ کا کوئی بھی امکان باقی نہ رہتا۔ پھر شاہی خاندان کے ایک شہزادے کی قیادت کا شہرہ عام ہوتا تو عام لوگ دوڑ دوڑ کر ساتھ ہو جاتے۔

ایک اور بیان

لفٹنٹ جنرل شاورز[2] اس زمانے میں ریاست میواڑ کے اندر ریزیڈنٹ کے طور پر مامور تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "غدر ہند کا ایک بھولا ہوا باب"۔

---

[1] جلد دوم صفحہ ۲۶۵ ۔ [2] SHOWERS ۔

اس کتاب میں زیادہ تر مغربی اور وسطی ہند کے وہ حالات بیان کیے گئے ہیں، جن پر عام مورخین نے زیادہ توجہ نہ کی تھی یا انھیں زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خاصی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی سالاری کا منصب فیروز شاہ نام ایک مذہب دوست اور مجاہد شہزادے نے سنبھال لیا۔ مندسور کے مسلمانوں نے دوسرے طبقوں کو ساتھ ملا کر ریاست گوالیار کی حکومت ختم کر دی اور شہزادے کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔

وہاں بہت سے میواتی، مکرانی اور افغان موجود تھے، وہ ساتھ ہو گئے۔ مندسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوئے۔ ایک افسر مارا گیا۔ پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔ خزانہ لوٹ لیا گیا، دفاتر جلا دیے گئے۔ "مرزاجی" نام ایک شخص کو جو وہاں کے قدیمی امرا میں سے تھا، وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

اہتمام کا یہ عالم تھا کہ جنوب سے تمام رستے منقطع کر دیے گئے۔ انگریز کوئی خبر نہ بھیج سکتے تھے۔ سرکاری ڈاک کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ انگریزوں نے قاصدوں کے ذریعے سے خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انھیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔[1]

شہزادے کی تگ ودو

ہمیں متفرق لڑائیوں کا ذکر یہاں نہ کرنا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ شہزادہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس مرکز کو تقویت پہنچائی جائے، جس پر باقی حصوں میں جنگ جاری رکھنے کا انحصار تھا۔ قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ گوالیار سے دھول پور پہنچا اور وہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ لیا۔ مگر وہاں دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر سُنی تو آگرہ کا رخ کیا۔ ایک روز آگرہ کا محاصرہ بھی جاری رکھا۔ بعد ازاں میوات چلا گیا۔ وہاں سے شیخ فضل الٰہی رسالدار اور جنرل عبدالصمد خاں کو ساتھ لے کر فرخ آباد اور شاہ جہان پور ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچ گیا۔[2]

میلی سن کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ شہزادہ انگریزوں کے حملے کے وقت دہلی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب شہر پر حملہ بے سود اور بے نتیجہ ہوگا تو دہلی سے مجاہدین کی جو فوجیں باہر نکلی تھیں، ان میں سے خاصی بڑی تعداد کو ساتھ لے کر ۲۶ ستمبر کو متھرا پہنچا۔ وہاں اس کے ساتھ ایک اور فوج مل گئی جس میں زیادہ تر ۷۲ دیسی پیادہ فوج کے آدمی تھے اور ہیرا سنگھ اس کا صوبیدار تھا۔ پھر

---

[1] شاد رز کی کتاب صفحہ ۸۹-۹۲۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۵۔

وسط ہند سے جو لوگ آئے تھے وہ بھی شامل ہو گئے۔[1] آگرہ کے لیے یقیناً بھاری خطرہ پیدا ہوا تھا لیکن اس کی تفصیلات اس لیے بیان نہیں کی جا سکتیں کہ وہ شہزادے کی سرگرمیوں میں نہیں آتیں۔

لکھنؤ میں ورود

میلی سن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نومبر ۱۸۵۷ء میں روہیل کھنڈ پہنچا تھا۔ اور وہاں سے اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جس زمانے میں انگریز بیلی گارد سے خارج ہو کر عالم باغ میں جا بیٹھے تھے اور لڑائی بڑے زور سے جاری تھی، اس زمانے میں شہزادہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ یہ یقیناً اواخر نومبر یا اوائل دسمبر کا واقعہ ہونا چاہیے۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ فیروز شاہ شہر میں پہنچا تو جنرل بخت خاں کے دو سو سوار اور پانسو تلنگے ساتھ تھے۔ سلطان بہو صاحب کے پاس فروکش ہوا۔ سلطان بہو نے حضرت محل سے کہلا بھیجا:

> میں محتاج ہوں، مجھ سے ان کی خدمت کیا ہو سکے گی۔ سرکار سے دوسرا مکان ان کے رہنے کو ملے تو بہتر ہے۔ اس جہت سے ایک مکان علیحدہ ان کے قریب تجویز ہوا۔ پانچ ہزار دعوت کے آئے۔[2]

ہمت و عزیمت

جب تک لکھنؤ میں مقابلہ جاری رہا، شہزادہ فیروز شاہ اسی جگہ رہا۔ جب لکھنؤ خالی ہوا تو وہ اپریل ۱۸۵۸ء میں احمد اللہ شاہ کے پاس پہنچ گیا اور شاہ جہان پور کی جنگ میں شاہ صاحب کے ساتھ تھا۔

سید کمال الدین حیدر فرماتے ہیں کہ شہزادہ لکھنؤ سے نکلا تو تھوڑی سی جمعیت اور ایک توپ کے ساتھ خان بہادر خاں کے پاس بریلی پہنچا۔ خان بہادر نے داخلہ شہر کی اجازت نہ دی تو مراد آباد چلا گیا۔ وہاں خان بہادر خاں کا چچا ناظم تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ شہزادے کے لیے چلے ہی جانا بہتر ہے۔ شہزادے نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور روزے سے ہیں، آج ٹھہرنے اور روزہ افطار کر لینے دیجیے، کل نجیب آباد چلے جائیں گے۔[3] ناظم نے قبول نہ کیا بلکہ فوج اور توپیں بھیج دیں۔ شہزادے نے مقابلہ کیا۔ ناظم کی فوج بھگا دی اور اس کا سارا سامان شہزادے اور اس کے ساتھیوں کو ملا۔ جن میں سے تین ہاتھی کچھ سامان اور دو ہزار روپے شہزادے نے اپنے لیے رکھے۔ اس کے بعد نواب رام پور کے بھائی کاظم علی خاں

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۶۷ ؛ [2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۳-۳۱۴ ؛ [3] رمضان ۱۰ اپریل سے شروع ہو چکا تھا۔

سے بھی جنگ ہوئی۔

پھر شہزادہ بریلی گیا تو خان بہادر خاں نے پرجوش خیر مقدم کیا۔ ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں لایا اور چاہا کہ انگریزوں سے جنگ کا پورا کاروبار حوالے کر دے۔ شہزادے نے خدا جانے کیوں یہ پیش کش منظور نہ کی اور وہ شاہ جہان پور چلا گیا۔[1]

میلی سن نے لکھا ہے کہ شہزادہ ۲۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پہنچا تھا اور روپیہ طلب کیا۔ نہ ملا تو اُس نے بہ زور لینا چاہا۔ ۲۶۔ اپریل کو انگریزی فوج قریب پہنچ گئی۔ مراد آباد میں سخت لڑائی ہوئی، لیکن شہزادہ بچ کر نکل گیا۔

ایک بے سروپا افسانہ

قیصر التواریخ میں بتایا گیا ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ، شاہ جہان پور سے محمدی پہنچا تو وہاں احمد اللہ شاہ نے بادشاہی کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا:

> اور نشہ غرور و نخوت جو دماغ میں سما گیا تھا شاہزادے سے بھی طالب بیعت و فرمانبرداری مثل اور خادموں کے ہوا۔ شہزادہ اس حرکت ناپسند پر سے خفا ہو کر سندیلہ میں آیا۔[2]

لیکن یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ احمد اللہ شاہ نے نہ اپنی بادشاہی کا اعلان کیا تھا اور نہ اس کا کوئی موقع تھا۔ شاہ جہان پور سے محمدی جانے اور وہاں سے ۵۔ جون کو پوائیں میں شہادت پانے تک زیادہ سے زیادہ تین ہفتے کی مدت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خطرات و تشویشات کے اس دور میں بادشاہی کے اعلان کا کون سا محل تھا۔ پھر یہ لوگ جس اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہے تھے، وہ اس طرح پورا نہ ہو سکتا تھا کہ ہر ایک جب چاہتا، اعلان حکمرانی کر دیتا۔ یہ افسانہ دشمنوں کا تراشا ہوا ہے۔ افسوس کہ قیصر التواریخ کا مصنف ایسے امور کا خیال نہیں رکھتا اور دوسرے اصحاب جنھیں صحیح حالات کا بہتر تصور اور بہتر اندازہ ہونا چاہیے روایتوں کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرتے ہے۔

سیر و گردش

قیصر التواریخ میں جن مقامات پر شہزادے کے ورود کا ذکر ہے ان کی کیفیت یہ ہے: سندیلہ، بانگر مئو، صفی پور، خیر آباد، باڑی، پھر بلہور کے گھاٹ سے دریائے گنگا کو

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔ ۴۶۷ ؎ [2] ایضاً صفحہ ۴۶۷ ؎

عبور کیا اور ملاحوں کو دو سَو روپے انعام دیئے۔ بعد ازاں کمن پور، درگاہ مدار، حوالی، اٹاوہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے شیر پور کے گھاٹ پر جمنا سے پار اترا۔ لڑائیاں بھی ہوئیں۔ خوب بہادری سے لڑا اور بہ سلامت نکلا چلا گیا۔[1]

میلی سن کا بیان ہے کہ باغیوں کے ایک گروہ نے ۷۔ اگست ۱۸۵۸ء کو موہان پر حملہ کیا تھا جو سئی ندی کے کنارے لکھنؤ سے کوئی سترہ میل پر ہے اور یہ گروہ فیروز شاہ کا ہراول تھا۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں شہزادہ اودھ کے شمالی حصے میں باغیوں کا سرخیل رہا۔ جب اُس نے تانتیا ٹوپے کے کارناموں کا ذکر سُنا تو اس کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ وہ سیتا پور کے پاس ایک مقام بسوا سے چلا۔ ۷۔ دسمبر کو دریائے گنگا سے گزرا۔ شاہراہ اعظم (گرانڈ ٹرنک روڈ) کے تار کاٹ دیئے۔ عام افواہ پھیلا دی کہ میں شمال و مغرب کی طرف جا رہا ہوں، لیکن اٹاوہ پہنچا۔ انگریزوں نے تعاقب کیا، ایک افسر مارا گیا اور شہزادہ صاف بچ نکلا۔ ۹۔ دسمبر کو جمنا سے گزرا[2] اور اس کے بعد اسے پکڑنا بالکل مشکل تھا۔

بعد کے حالات

بعد کے حالات زیادہ تفصیل کے محتاج نہیں۔ اس لیے کہ لڑائیاں کم ہوئیں، صرف بچاؤ اور تعاقب کا طویل سلسلہ جاری رہا۔

۱۔ شہزادہ رانود پہنچا جو ریاست گوالیار کا مشہور مقام ہے، وہاں انگریزوں سے لڑائی ہوئی۔ پھر وہ آرونی کے جنگلات میں چلا گیا۔

۲۔ ایک موقع پر اس نے انگریزوں کے ایک رسد رساں گروہ کا سامان لوٹ لیا۔

۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو وہ اندر گڑھ میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ راؤ صاحب بھی ان کے ساتھ تھا۔

۴۔ ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو تانتیا ٹوپے سے الگ ہوا۔

۵۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سرونج کے جنگل میں تھا۔

۶۔ پھر وہ زائروں کا بھیس بدل کر کربلا چلا گیا اور ۱۸۶۹ء تک وہیں تھا۔[3]

دوسرا بیان

مفتی انتظام اللہ کا بیان ہے کہ حیدرآباد سندھ ہوتے ہوئے شہزادہ کابل گیا۔ وہاں سے ایران و روس ہو کر حجاز پہنچ گیا۔ مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کر لی، جہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، شاہ عبدالغنی دہلوی، مولانا یعقوب دہلوی، مولانا شاہ اسحاق دہلوی، مولانا

۱؎ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۶۷-۴۶۸ ۔ ۲؎ میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۵۱ ۔ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۵۸

محمد مظہر مجددی، ہدایت و اصلاح کی غرض سے ایک جماعت بنائے بیٹھے تھے۔ نواب فیض احمد خاں رئیس ونادلی، مولوی واعظ الحق بہاری، حکیم نوازش حسین بہاری اور شہزادہ فیروز شاہ بھی اسی جماعت کے رکن ہو گئے۔ ایک ترکی خاتون سے نکاح کر لیا تھا۔ صرف دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ ۱۸۹۵ء کے بعد انتقال ہوا۔ ان کی ایک ہمشیرہ کلثوم زمانی بیگم فقیرانہ لباس اختیار کر کے ببرٹھ چلی گئیں اور باقی عمر نواب ممتاز علی خاں نبیرۂ نواب خیر اندیش خاں کے یہاں بسر کر دی۔ بھائی کے لیے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔[1]

تیسرا بیان

قیصر التواریخ میں مرقوم ہے کہ کئی برس جے پور کے جنگلوں، بیکانیر یا دامن کہسار دکن میں سرگرداں رہا۔ وہاں قوم بھیل بھی شریک ہو گئی۔ آخر کار اٹک دریا اتر کر کابل سے داخل ملک ایران ہوا، وہاں سے رہبر پا کر روس چلا گیا:

> کہتے ہیں کہ وہاں اپنی جماعت کے ساتھ بخوبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں کی سلطنت سے بہ جہت نامدری کچھ کفالت ہوتی ہے۔ . . . ان کی اولوالعزمی و شجاعت سرکار پر ثابت تھی کیا عجب تھا اگر بہ تالیف ان کے واسطے بھی کچھ کفالت ہو جاتی جس طرح زمانہ ماضیہ میں لارڈ ماٹرا صاحب نے صاحبان اولوالعزم کو کچھ ملک بسر اوقات کے واسطے دے کر سرکار کو نیک نام کیا، مثل نواب امیر خاں، ہولکر وغیرہ مگر یہ کہیے کہ وہ زمانہ اور تھا، حکام کی نیت بہ خیر تھی۔ اب اور صورت ہے۔[2]

چوتھا بیان

ہندوستان سے سلامت بچ کر نکل جانے پر تمام بیانات متفق ہیں لیکن بعد کے حالات میں اختلاف ہے جیسا کہ اوپر کے بیانات سے ظاہر ہو گیا ہو گا مثلاً میلی سن کے نزدیک شہزادہ کربلا میں تھا مفتی انتظام اللہ کے نزدیک مکہ معظمہ میں اور قیصر التواریخ کے نزدیک روس یا ترکستان میں، اس لیے کہ ترکستان بعد میں روس ہی کا حصہ بن گیا تھا۔

اب چوتھا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے متعلق ذخیرہ معلومات سے ماخوذ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ اپریل ۱۸۷۸ء میں جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبد اللہ سے باج کٹھ (علاقہ بونیر سرحد

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۵۔ یہاں صرف یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا شاہ اسحاق ۱۸۵۷ء سے بارہ سال پیشتر فوت ہو چکے تھے۔
[2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۶۸۔

آزاد) میں ملا تھا اور کچھ مدت وہاں قیام پذیر بھی رہا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوتی رہیں اور کس وجہ سے شہزادہ واپس چلا گیا۔ قیاس یہ ہے کہ اُس نے سمجھا ہو گا جماعت مجاہدین یقیناً انگریزوں سے لڑ رہی ہے اور اس کے ساتھ مل کر پھر آزادی کے لیے جہاد شروع کرنا چاہیے۔ جب معلوم ہوا کہ جماعت کی تعداد تھوڑی ہے، ساز و سامان اور وسائل بھی معمولی ہیں تو وہ واپس چلا گیا۔ اہلِ سرحد کا بیان یہی ہے کہ ترکستان کے کسی شہر میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ بہر حال امیر عبداللہ سے اپریل ۱۸۶۸ء میں ملاقات کا واقعہ مستند ہے۔

پانچواں بیان میرے عزیز دوست سید اولاد علی شاہ گیلانی (ادارہ دائرۃ المعارف) نے بتایا کہ میں ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں زیرِ تعلیم تھا۔ ایک روز اپنے مکان کے اس کمرے میں بیٹھا تھا جو میرا دار المطالعہ تھا اور بازار میں اس کا دروازہ کھلتا تھا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے دروازہ کھولا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ میں نے اعزاز سے انھیں اندر بلایا اور وہ دو روز اسی کمرے میں میرے پاس ٹھہرے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں فیروز شاہ ہوں۔ کئی مرتبہ آیا ہوں، اب مجھ میں بھی زیادہ سکت باقی نہیں رہی اور ملک کے حالات میں بھی کوئی امید افزا جھلک نظر نہیں آتی۔ صرف ایک جماعت مجاہدین میں ہمت ہے اور وہ جاندار دکھائی دیتی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے ڈر ضرور لگ رہا تھا کہ شہزادہ بہت بڑا سیاسی آدمی ہے۔ مبادا اس کی وجہ سے کوئی آفت نازل ہو جائے تاہم انھیں دیکھتا تھا تو بے اختیار عزت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں نے خود ان سے کچھ نہ پوچھا اور نہ اتنی سمجھ تھی کہ پوچھتا۔ جو کچھ وہ بتاتے رہے، وہی سُنتا رہا۔ تاہم پچاس سال گزر جانے کے باوجود اس عجیب و غریب شخصیت سے ملاقات کے نقوش حافظے میں بالکل تازہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی فیروز شاہ تھے یا کوئی اور بزرگ تھے۔

یہ شہزادہ فیروز شاہ تھا جس کے متعلق میکمن نے بالکل درست لکھا ہے کہ اس نے اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے مقابلے میں جو دہلی میں تھے، کردار کا زیادہ اچھا نمونہ پیش کیا۔[1]

---

[1] میکمن صفحہ ۲۲۴۔

مولانا فضل حق خیر آبادی

خاندان مولانا فضل حق ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے۔ جن کے علم و فضل اور یگانہ کمالات کے باعث پورے خاندان کی شہرت کو چار چاند لگے۔ مولوی رحمٰن علی مصنّف تذکرۂ علماے ہند انھیں عمری، حنفی، ماتریدی اور چشتی لکھتے ہیں، یعنی مولانا کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، فقہی لحاظ سے وہ حنفی تھے، عقائد میں ماتریدی اور سلسلہ چشتیہ میں اُنھوں نے بیعت کی تھی۔

ان کے والد مولانا فضل امام کو دہلی میں صدر الصدور کا منصب حاصل تھا۔ والد سے تعلیم پائی۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی سے حدیث پڑھی[1]۔ مولانا عبد الشاہد خاں شروانی نے اساتذہ حدیث میں شاہ عبد العزیز محدث کا اسم گرامی بھی شامل کیا ہے[2]۔ سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ حافظہ اتنا اچھا تھا کہ چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا[3]۔

علمی کمالات ایک روایت ہے، جسے مولانا عبد الشاہد خاں نے تواتر کا درجہ دیا ہے کہ شاہ عبد العزیز محدث کی تحفہ اثنا عشریہ شائع ہوئی تو ایران سے ملا باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کر دی۔ پہلے افق المبین پر اعتراضات کیے، جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ سُن کر اتنا متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا[4]۔ سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کا یہ حال ہے، وُہ خود خُدا جانے کیسا ہو گا۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴۔ [2] الثورۃ الہندیہ ص ۲۹۔ [3] تذکرہ علماے ہند ص ۱۶۴۔ [4] الثورۃ الہندیہ ص ۲۳-۲۴۔

مولوی رحمٰن علی لکھتے ہیں کہ میں نے لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا، دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے، ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو افق المبین کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرمائے جاتے تھے۔[1]

درس و تدریس اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ طلب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دیا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی۔ چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا جو غالباً کند ذہن تھا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھوا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی۔ چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستارِ فضیلت دور جا پڑی۔ پھر فرمایا:

> تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی۔ جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے۔ اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔[2]

بہرحال مولانا نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی بھی دور میں درس و تدریس ترک نہ کی۔ جو بھی فیض حاصل کرنے کے لیے آتا، اسے بے تامل مستفیض فرماتے۔ یہاں تک کہ مشاغل تفریح میں بھی اس کا خاص خیال رکھتے جیسا کہ مولوی رحمٰن علی کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے۔

مولانا نے دھومن شاہ دہلوی سے بیعت کی۔

ملازمت والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ اس زمانے میں ملازمت اختیار کر لی اور ریزیڈنٹ دہلی کے دفتر میں سر رشتہ دار بن گئے۔ پھر نواب فیض محمد خاں والیِ جھجر نے پانسو روپے ماہوار پر انھیں بلا لیا۔ روانگی کے وقت ولی عہد (بعد ازاں بہادر شاہ ظفر) سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اڑھایا اور آبدیدہ ہو کر کہا: جب آپ رخصت کا ذکر کرتے ہیں تو میرے لیے اسے قبول کیے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ رخصت کا لفظ دل سے زبان پر لانے کے لیے ایک سو آلات جرثقیل استعمال کرنے پڑتے ہیں۔[3]

جھجر کے بعد الور چلے گئے، بعد ازاں آٹھ برس رام پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنا دیے گئے۔ جب

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴ - [2] الثورۃ الہندیہ ص ۳۶-۳۷ - [3] کلیات نثر غالب فارسی -

ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔ ایک روایت ہے کہ مولانا نے ہنومان گڑھی کے واقعہ الیمہ سے متاثر ہو کر لکھنؤ کی ملازمت چھوڑی۔ دوسری روایت ہے کہ ترک ملازمت مولانا احمد اللہ شاہ سے بات چیت کا نتیجہ تھا۔ بہر حال ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے نکل کر آپ الور چلے گئے۔

مولانا کی زندگی علم و فضل میں مولانا وقت کے ممتاز ترین اصحاب میں سے تھے لیکن افکار و خیالات یا معتقدات کی بناء پر ان کی حیثیت بہت ہی معمولی تھی۔ زندگی بھی امیرانہ تھی جسے جفاکشی یا مجاہدے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ دہلی میں میرزا غالب سے گہری دوستی تھی اور میرزا کی پوری زندگی لاابالی تھی۔ امتناع نظیر خاتم النبیین اور امکان نظیر کے بارے میں شاہ اسماعیل شہید سے نزاع چھیڑ لی جو بالکل بے محل تھی۔ اس سلسلے میں مشیت اور قدرت کا فرق ملحوظ نہ رکھا۔ بڑے نازک مزاج تھے۔ شطرنج کا بہت شوق تھا۔ غرض ان کا عام طریقہ وہی تھا جو اس زمانے کے امرا کا تھا اور کسی کو اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ آرام طلبی، تن آسانی اور امیری کے جنجال سے نکل کر آپ جفاکش مجاہدوں کے حلقے میں پہنچ جائیں گے۔

مولانا اور سیاست جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں مولانا کو ابتدائی زندگی میں کبھی سیاسی امور کی طرف توجہ نہ ہوئی۔ ان کا خاص ذوق یہ تھا کہ جہاں رہیں عزت سے رہیں، اچھی تنخواہ ملے، آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں، علم کا ذوق رکھنے والوں کو درس بھی دے دیا کریں اور بس چنانچہ اسی اسلوب و نہج پر ان کی زندگی گزر گئی غالباً آخری دور میں بعض دوسرے حساس و دیدہ ور اصحاب کی طرح ان پر بھی انگریزی تسلط کی خرابیاں منکشف ہوئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت میں تکدر پیدا ہوا جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔

محرکات مخالفت مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، انھیں یہاں خلاصۃً درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ داعیہ تبدیل مذہب۔

۲۔ پیداوار کاشتکاروں سے لے کر انھیں نقد دام دینا، اس طرح خود خام جنسوں پر قابض ہو کر منڈیوں کے نرخ گھٹانے بڑھانے کا مختار بن جانا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو خوراک نہ ملے گی تو وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں گے۔

۳۔ مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین کو مٹانا۔

۴ - ہندو اور مسلمان لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانا اور انھیں مذہب و عقائد سے گمراہ کرنا -

ان محرکات پر بحث کی ضرورت نہیں، ان میں سے بعض پر مفصل گفتگو جنگِ آزادی کی سرگزشت میں ہو چکی ہے، بعض ایسے ہیں کہ انھیں آج شاید محض وسوسہ سمجھا جائے، لیکن اُس زمانے میں مولانا کی طرح اکثر اصحاب کو قرائن کی بناء پر یقین ہو گیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے -

دہلی میں ورود

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے وقت مولانا الور میں تھے - کہا جاتا ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے نشر و اشاعت کرتے رہے اور اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے[۱] - مجھے اس نشر و اشاعت کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی -

دہلی پہنچنے کے بعد جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں، وہ دربار میں آتے جاتے ضرور رہتے، بادشاہ سے مل کر باتیں بھی کرتے تھے - بعض اوقات فرامین بھی لکھتے تھے لیکن ان سے کوئی خاص کام نہ لیا گیا - جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶؍ اگست کو انھوں نے دربار میں حاضر ہو کر ایک اشرفی بہ طور نذر پیش کی[۲] - یہ غالباً الور سے آکر پہلی حاضری تھی - ۱۸؍ اگست کے حالات میں مرقوم ہے کہ مولانا نے انگریزی اخباروں کی رپورٹ کا ذکر کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ فتح دہلی کے بعد قتل عام کیا جائے گا، شہر کا نشان مٹا دیا جائے گا، بادشاہ کے حق میں ایک بھی صدا بلند نہ ہونے دی جائے گی اور نہ اُسے پانی کا ایک قطرہ ملے گا - ساتھ ہی مولانا نے کہا، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ سپاہی انگریزوں کی مخالفت چھوڑ دیں - کیونکہ وہ انگریزوں کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے[۳] -

۵؍ ستمبر اور ۷؍ ستمبر کے حالات میں محض مولانا کی شرکت دربار کا ذکر ہے، ۶؍ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ مولانا نے عرض کیا، متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے[۴] -

بہادر شاہ کے مقدمے میں ذکر ہے کہ ۱۸؍ اگست ۱۸۵۷ء کو دوسرے افراد کے علاوہ مولانا نے بھی مختلف اشخاص کے نام فرامین لکھے لیکن اُن پر مُہریں نہ ہو سکیں اس لیے کہ نواب زینت محل ملکہ عالم استراحت فرما رہی تھیں اور مُہر انھیں کے پاس تھی[۵] -

---

[۱] الثورۃ الہندیہ ص ۱۵۲ - [۲] دو روزنامچے ص ۱۹۶ - [۳] ایضاً ص ۱۹۸ - مجھے یقین ہے کہ یہاں اُردو روزنامچے کے انگریزی مترجم سے شدید غلطی ہوئی ہے یہ رائے کسی اور کی ہوگی جو مولانا سے منسوب کر دی گئی - [۴] دو روزنامچے ص ۲۱۷، ۲۲۴، ۲۲۳

[۵] مقدمہ بہادر شاہ ص ۱۸۲ -

دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ مولانا نے مولوی عبدالحق خاں کے نام ضلع کوڑ گانوہ کے مالیے کی تحصیل کے لیے فرمان لکھوایا اور مولانا کے ایک عزیز کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔[1]

صورتِ حال کے متعلق تاثرات

مولانا کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں صورتِ حال کے معائنے کے بعد انھیں کو نتیجے کے متعلق کوئی حسنِ ظن نہ رہا تھا، وہ فرماتے ہیں:

۱۔ بہادر شاہ ضعیف، غم زدہ اور ناتجربہ کار تھا۔

۲۔ وہ آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی اہلیہ اور وزیر یعنی زینت محل اور حکیم احسن اللہ خاں کا ماُمور و محکوم تھا۔

۳۔ اس کے بیٹے عاقبت نااندیش، سفیہ، خائن اور بزدل تھے۔ انھیں دیانت دار عقل مندوں سے نفرت تھی۔

۴۔ انھیں نہ کبھی میدانِ جنگ سے سابقہ پڑا تھا نہ فنونِ حرب سے آگاہ تھے۔ بازاری لوگوں کو انھوں نے اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا تھا۔

انگریزوں کا مقابلہ کرنے والوں میں بعض بے سردار تھے اور بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر لی تھی، صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

ظاہر ہے کہ ان تاثرات کے بعد مولانا یہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے کہ نتیجہ حسبِ مراد نکلے گا؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بحث نتیجے سے نہ تھی صرف یہ مطلوب تھا کہ جو کچھ ہو سکتا ہے اس میں توقف نہ ہونا چاہیے۔

فتویٰ

مولانا کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علماءِ دہلی سے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھیں نے علماء کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔ اسی فتوے پر مفتی صدرالدین آزردہ کے دستخط تھے جن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک لطیف توجیہ کی گئی اور مفتی صاحب الزام شرکت سے بری ہوئے۔ غالباً یہی فتوے تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا، ورنہ انھوں نے نہ کسی جنگ میں حصّہ لیا تھا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔

دہلی سے روانگی

۱۹ ستمبر کو شہر دہلی فتح ہوا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ روز بھوکے پیاسے مکان میں

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ ص ۱۸۴۔

بند رہے۔ پھر اہل و عیال کو ساتھ لیے کر رات کے وقت چھپ چھپا کر نکلے اور مشقتوں کے بعد بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے، وہاں اٹھارہ روز چھپے رہے، ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے، دریا کے پار اُتار دیا[۱]۔ وہ کچھ مدت چھپے رہے، یہ زمانہ کہاں کہاں گزارا؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

گرفتاری

جب ملکہ وکٹوریا کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہوا تو مولانا بھی اس پر بھروسا کر کے خیرآباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

> مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسا اور بے دین کی قسم و یمین پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزائے و سزائے آخرت کا بھی قائل نہ ہو[۲]۔

چند روز اطمینان سے گزر گئے، پھر دو آدمیوں نے مولانا کی مخبری کی جنھیں وہ مرتد، جھگڑالو اور تند خو بتاتے ہیں[۳] چنانچہ انھیں مکان سے جا کر گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا[۴]۔ سیر العلماء کا بیان ہے کہ مولانا ۱۸۵۹ء میں سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے اور ان پر سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتوائے جہاد یا جرم بغاوت میں مقدمہ چلا۔

مقدمے کے حالات

مقدمے کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ اسیروں میں سے ایک نے واقعات سن کر مولانا کو رہا کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے، لطف یہ کہ:

> چند الزام اپنے اُوپر خود ہی قائم کیے، پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام سیکھا تھا ...[۴]

دوسرے دن مولانا نے مخبری کی تصدیق کر دی اور کہا کہ واقعی فتویٰ میں نے دیا تھا۔ گواہ نے پہلے سچ کہا تھا اب میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور اس نے جھوٹ بولا۔ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے[۵]۔

۱؎ الثورۃ الہندیہ ص۱۵۸۔ ۲؎ ایضاً ص۱۶۴۔ ۳؎ ایضاً ص۱۶۷۔ ۴؎ بحوالہ الثورۃ الہندیہ ص۱۶۸۔
۵؎ ایضاً ص۱۶۸-۱۷۰۔

یہ بیان میرے نزدیک سراسر بے اصل ہے، اصل معاملہ بے حد نازک تھا اور اس کے ساتھ مولانا کی زندگی وابستہ تھی یہ بات ذہن میں نہیں آسکتی کہ انھوں نے اسے اپنے علمی کمالات یا زورِ استدلال کی نمایش کا ذریعہ بنالیا ہو، وہ اس طرح کہ کبھی اپنے اوپر الزام لگالیے اور کبھی رد کر دیے۔ پھر خود ہی ہر شے کا اقبال کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولات میں مولانا کی یگانگی کے پیشِ نظر لوگوں نے بہ طور خود داستان بافیاں کر لیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس جج کو مولانا کا شاگرد اور ہمدرد بتایا گیا اس کے متعلق خود مولانا اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا ......

اس ظالم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا[1]

اس واضح ارشاد کے بعد کیوں کر مانا جا سکتا ہے کہ حاکم مولانا سے واقف تھا اور چونکہ ان سے کام سیکھ چکا تھا، اس لیے ہمدردی تھی۔

حبس دوام بہ عبور دریائے شور

بہرحال مولانا کے لیے حبس دوام کا حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں، جایداد، مال و متاع، اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر شے ضبطی میں آگئی۔

میرزا غالب کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ اس فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا گیا تھا لیکن فیصلہ بحال رہا بلکہ تاکید کر دی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان روانہ کر دو۔

مولانا بالکل بجا فرماتے ہیں کہ قید میں ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے تھے اور ان کا شمار علمائے اعلام میں ہوتا تھا[2]

مولانا نے پوری زندگی اعلیٰ درجے کے امیرانہ انداز میں گزاری تھی۔ قید میں انھیں ایسی خوفناک تکلیفوں سے سابقہ پڑا جو معمولی قیدیوں کو بھی شاید ہی پیش آئی ہوں کس درد سے فرماتے ہیں:

دشمن میری ایذارسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے ہیں۔ دوست میرے مرض کے علاج سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض اور کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے، ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے گنجینے بن گئے ہیں، ان اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی رہائی سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں[3]

---

[1] بحوالہ الثورۃ الہندیہ صفحہ ۳۱۴ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۴ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۴۲۷-۴۲۸ ۔

انڈیمان کی زندگی کچھ معلوم نہیں کہ کب انڈیمان پہنچے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان سے پیشتر مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریا بادی اور بہت سے دوسرے علماء وہاں پہنچ چکے تھے، لہٰذا جس حد تک صحبت و مجلس کا تعلق ہے انڈیمان یہاں کے اکثر شہروں سے زیادہ جاذب و گیرا بن گیا تھا۔ لیکن معاملہ قید کا تھا اور قید اس زمانے میں بڑی ہی سخت تھی بلکہ انڈیمان میں تو بعد ازاں بھی بڑی سخت رہی۔

مولانا نے انڈیمان کا جو نقشہ چند الفاظ میں کھینچا ہے، وہ آج کل بھی نادرست نہیں اور مولانا کے زمانے میں تو حرف بہ حرف درست تھا۔ وہ فرماتے ہیں، آب و ہوا نا موافق، پہاڑی علاقہ، اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں، وہاں کی نسیم سحر گرم و تیز ہوا سے بھی زیادہ سخت، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر خور رسان اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں۔

پھر قید خانے کی کیفیت بتاتے ہیں، ہر کوٹھڑی پر چھپر جس میں رنج و مرض بھرا ہوا، چھتیں ٹپکتی تھیں، مرض ارزاں، درد گراں، بیماریاں بے شمار، خارش و وبا عام، بیمار کے علاج، تندرست کی بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔

وہ خود بھی متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گئے، خارش کے باعث بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا، روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہا۔

حالات میں تبدیلی بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا انڈیمان میں پہنچے تو انھیں صفائی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ ٹوکرا لے لیتے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینک آتے، ان کے کپڑے اتروا لیے گئے تھے، تہبند اور کملی دے دی گئی تھی، پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ کی پیشی میں ایک مولوی تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ مولوی کو دے کر کہا کہ اس کی عبارت درست کر دی جائے۔ مولوی یہ کام مولانا کے پاس لے آیا۔ اُنھوں نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ مطالب میں اضافے اور حاشیے پر کتابوں کے حوالے دے دیے۔ اس طرح مولانا کے علم و فضل اور علو مرتبت کا حال سپرنٹنڈنٹ پر کھلا۔ اس وقت سے مولانا کے لیے برائے نام محرری کا کام تجویز کر دیا گیا اور تکلیفوں میں ایک حد تک کمی آگئی۔

وفات ادھر مولانا کے صاحبزادے نے ولایت میں مرافعہ کر دیا تھا، وہ منظور ہوا اور مولانا کی رہائی کا حکم آگیا صاحبزادہ انھیں لانے کے لیے انڈیمان روانہ ہو گیا۔ جہاز سے اُترنے پر ایک جنازہ نظر پڑا، جس کے ساتھ بڑا مجمع تھا،

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا جنازہ ہے۔

۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۹ اگست ۱۸۶۱ء) کو اس جہانِ فانی سے عالم بقا کی جانب سدھارے۔ مولانا عبدالشاہد خاں فرماتے ہیں کہ مولانا کا مزار اَب تک مرجع انام اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔[1]

دیکھیے جہادِ آزادی نے خاک وطن کے کتنے جواہر پاروں کو ان سنسان اور وحشت ناک جزیروں کی آغوش میں پہنچا دیا، جہاں کوئی اِنسان بہ طیب خاطر ایک دِن بھی بسر کرنا گوارا نہ کرے:

خیزند چوں زخاک شہیدان ما بحشر
در محشر آوریم دو عالم سیاہ را

تصانیف

مولانا نے گوناگوں مشاغل کے باوجود تصانیف بھی خاصی مقدار میں چھوڑیں:

۱ - الجنس الغالی شرح جواہر العالی
۲ - حاشیہ افق المبین
۳ - حاشیہ تلخیص الشفا
۴ - حاشیہ شرح سلم
۵ - الہدیۃ السعیدیہ
۶ - رسالہ تشکیک ماہیات
۷ - رسالہ کلی طبعی
۸ - رسالہ علم و معلوم
۹ - الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
۱۰ - رسالہ قاطیغوریاس
۱۱ - رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام
۱۲ - الثورۃ الہندیہ یعنی حالاتِ جنگ آزادی
۱۳ - قصائد فتنۃ الہند
۱۴ - مجموعۃ القصائد
۱۵ - امتناع نظیر
۱۶ - تحقیق الفتویٰ فی الطغوی۔

مولانا ویسے تو علم و فضل کا دریا تھے لیکن عربی ادب اور معقول میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔

ازواج و اولاد

مولانا نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ سے تین صاحبزادیاں تھیں اور ایک صاحبزادہ یعنی شمس العلماء مولانا عبدالحق، دوسری اہلیہ سے دو صاحبزادے تھے، مولوی شمس الحق اور مولوی علاءالحق۔

تلامذہ کا حد و شمار نہیں، بلکہ کہنا چاہیے، بعد کے دور کے اکثر اکابرِ علم انھیں کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۱۷۷۔

مولانا لیاقت علی الہ آبادی

ابتدائی حالات

مولانا کا اصل وطن پرگنہ چاٹل ضلع الہ آباد کے کسی گاؤں میں تھا۔ علمی گھرانے کے فرد تھے۔ باقاعدہ تعلیم پائی۔ پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نرے عالم نہ تھے۔ زہد و تقدس میں بھی درجہ امتیاز حاصل تھا۔ قادریہ سلسلے میں بیعت تھے۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کر رکھی تھی۔ مفتی انتظام اللہ لکھتے ہیں:

> وعظ و تذکیر میں اقتدار نصاریٰ پر تلمیحاً اشارے کر جاتے اور اپنے مریدین کو جہاد کی ترغیب و تشویق کی تلقین کرتے۔ سرکاری فوج میں بھی آپ کے اثرات تھے۔[۱]

میلی سن کا بیان

میلی سن نے لکھا ہے کہ معاصر وقائع نگار مولوی صاحب کا نام و نسب دریافت نہ کر سکے اور ہیں نے بعد میں جو تحقیقات کی، اس سے بھی کچھ زیادہ روشنی نہ مل سکی۔ ایک بڑے افسر نے بتایا کہ غدر سے پیشتر یہ شخص غیر معروف تھا کہا جاتا ہے کہ اسے لکھنؤ بھیجا گیا تھا۔ مسٹر ویلاک[۲] نے لکھا ہے کہ مولوی لیاقت علی:

> ذات کے بافندے تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا۔ انتہائی تقدس کے باعث انھوں نے اپنے گاؤں میں بڑی عزت و حرمت حاصل کر لی تھی۔ جب بغاوت کا آغاز ہوا تو پرگنہ چاٹل کے زمینداروں نے جو کسی بھی قائد کی پیروی کے لیے تیار تھے، اس شخص کو اپنا سردار بنا لیا اور شہر پر حملہ بول دیا۔ شاہ دہلی کی طرف سے اسی کو ضلع کا گورنر بنا دیا گیا۔[۳]

---

[۱] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۸۔ [۲] WILLOCK۔ [۳] میلی سن جلد دوم صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۸ حاشیہ۔

ضروری گزارشات

اس بیان کا تضاد کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اگر مولانا لیاقت علی غیر معروف تھے تو انھیں اپنے گاؤں میں خاص عزت و احترام کا درجہ کیوں کر حاصل ہوگیا؟ اگر وہ واقعی محترم نہ تھے تو زمینداروں کو یہ خیال کیوں کر آیا کہ انھیں اپنا سردار بنالیں؟

پھر ان کی ذات یا پیشے میں تحقیر کا کون سا پہلو ہے؟ اور بافندگی کون سی ذات ہے؟ یہ تو بہر حال ایک پیشہ ہے جس طرح دوسرے سینکڑوں پیشے ہیں۔ یقیناً مولانا لیاقت علی ۱۸۵۷ء سے پیشتر خاص درجہ امتیاز و شرف حاصل کر چکے تھے، اول اس لیے کہ صاحب علم تھے، دوم اس لیے کہ حد درجہ خدا پرست، نیک اور صالح بزرگ تھے۔ عوام میں انھیں یقیناً خاصی شہرت حاصل ہوگی۔ باقی رہے حکام تو ان میں شہرت حاصل کرنا مولانا کا مقصد ہی نہ تھا۔ انگریز حکام کے نزدیک وہی لوگ معروف سمجھے جا سکتے تھے جو یا تو بڑی جاگیروں کے مالک تھے یا رات دن انگریزوں سے ملتے جلتے اور ان کے مقاصد کی پیش برد کے لیے کوششیں کرتے رہتے تھے۔

الہ آباد میں انقلاب

الہ آباد میں بے چینی تو اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی جب سپاہ میرٹھ کی سرکشی کے متعلق اطلاعات شائع ہوئی تھیں۔ پھر میلی سن کے قول کے مطابق آہستہ آہستہ اک گونہ "منظم بغاوت" کا آغاز ہوگیا۔

> وہاں ایک آدمی "مولوی" کر کے مشہور تھا۔ اس نے شاہنشاہ دہلی کی حکومت بحال ہونے کا اعلان کر دیا اور سرکش آبادی اس کے گرد جمع ہوگئی۔ بہت تھوڑے آدمی اس وقت بتا سکتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا؟ البتہ بعد میں معلوم ہوگیا کہ "دوآبہ" کے ایک مسلمان گاؤں کا باشندہ تھا جس نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔[1]

بہر حال مولانا نے جہاد آزادی کی قیادت سنبھال لی اور خسرو باغ کو اپنا مستقر بنالیا۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان کا نسب و حسب پوچھنے کی کسی کو کیا ضرورت تھی؟ پیش نظر مقصد کے لیے یہی کافی تھا کہ مولانا انگریزوں سے سخت متنفر تھے اور مسلمانوں کو یہ یقین دلا سکتے تھے کہ اسلامی حکومت بحال ہوگئی ہے:

> اس طرح تھوڑی دیر کے لیے وہ عارضی حکومت کا چربہ اتارنے میں کامیاب ہوگئے اور مولوی کا نام پیروان حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا۔[2]

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۱۹۶۔ [2] ایضاً، ایضاً۔

عارضی حکومت کی کیفیت

جتنے انگریز باقی رہ گئے تھے وہ قلعے میں ہو بیٹھے تھے۔ مولانا روزانہ اپنے ساتھیوں کو قلعے پر یورش کے لیے دعوت دیتے۔ وہ لوگ وقتاً فوقتاً کچھ مظاہرے کرتے بھی رہتے تھے، لیکن انگریزی توپوں کی زد سے ہمیشہ باہر ہی رہنے کا خیال رکھتے تھے۔

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ خسرو باغ میں مولانا کے مریدوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھی ایک تعداد جمع ہوگئی تھی جن کا افسر رام چند تھا۔ مولانا نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے شہر کا انتظام دُرست کیا۔ لوٹ کھسوٹ بند ہوگئی۔[1]

مولانا کا پہلا اشتہار

پنڈت کنہیا لال نے لکھا ہے کہ مولانا نے دو اشتہار بھی شائع کیے تھے جو اودھ، الہ آباد اور دوسرے مقامات پر بھیجے گئے۔ پہلے اشتہار میں تو اس جہادیہ میں سے ابتدائی اشعار دیے گئے تھے جو مولوی خرم علی صاحب بلہوری کے نام سے منسوب ہے اور جسے سید احمد شہید کے مجاہدین اکثر میدان جنگ میں پڑھا کرتے تھے۔[2] پوری نظم ستاون اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا کے اشتہار میں صرف ابتدائی ستائیس اشعار لے لیے گئے نیز چوبیسویں پچیسویں اور چھبیسویں شعر میں ترمیم کرلی گئی تھی۔

ممکن ہے مولانا نے اشتہار میں اتنے ہی شعر درج کرنا مناسب سمجھا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ پنڈت کنہیا لال نے اشتہار کی پوری نظم درج کرنے کی بجاے صرف ابتدائی حصہ درج کرنے پر اکتفا کیا ہو۔[3]

دوسرا اشتہار

مولانا کا دوسرا اشتہار اب ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بدیں خیال یہاں درج کیا جاتا ہے کہ محفوظ ہو جائے۔

"بعد حمد و صلوٰۃ کے واسطے رفع حجت بروز قیامت و تبلیغ احکام شریعت کہ طریقہ سنّت ہے، خادم الطلبہ، احقر الفقرا، امیدِ رحمت رب غنی، محمد لیاقت علی الہ آبادی، چند باتیں ضروری، فرمان واجب الاتقان، یعنی قرآن مجید و فرقانِ حمید اور ارشاد فیض بنیاد برگزیدہ لم یزل

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۸۔ [2] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب سید احمد شہید جلد دوم صفحہ ۲۵۸-۲۱

[3] محاربہ عظیم صفحہ ۱۹۹۔

حضرت نبی صلعم سے بخوبی ثابت و متحقق کر کے مسلمان باایمان کو سناتا ہے کہ جو بدعات ظلم و فساد ساری سلطنت ہندوستان میں بخصوصاً ضلع الہ آباد میں کفرہ فجرہ نصاریٰ کا علی العموم اوپر ہر ایک مومن متبع اسلام کرام کے از قبیل غارت گری و آتش زدگی و قتل و پھانسی و کندہ بدگی مکان و چھاپہ زنی و خونریزی علماءٔ و مشائخان و احراق کلام اللہ و احادیث و کتب فقہ وغیرہ ہو رہا ہے۔ اظہر من الشمس ہے۔ اس صورت میں مومنین مخلصین کو لازم ہے کہ متحد جہاد ہو جاویں۔ بہ موجب ارشاد فیض بنیاد آنحضرت صلعم کے لکل نبی حرفۃ وحرفتی الجہاد واسطے ہر نبی کے پیشہ ایک مقرر رہا ہے اور پیشہ میرا ہے جہاد، بے شک جس نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا، وہ ذلیل و خوار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہوا۔ فقط۔"

دعوت عام

اب بہ موجب " ان الجنۃ تحت ظلال السیوف " فائدہ اخروی اٹھاویں اور درجہ شہادت کا جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے اور نعمائے جنت اور ازواج حوران بہشت پاویں اور کسی طرح کا شک و خطرہ بد دل میں نہ لادیں اور جان و مال سے اور لنگر سواد و رائے صائب و ہتھیار وغیرہ سے جہاں تک ممکن ہو شرکت بجالاویں ایسا نہ ہو کہ اوقات سعید اور آواز حمید میں شرکت سے محروم رہیں اور پچھتاویں اور جو شخص اس مقدمے میں پیشوائی کرے اسی کو اپنا امام سمجھ کر بہ موجب " الجہاد واجب علیکم مع کل امیر براً کان او فاجراً " کی تابعداری کریں کیونکہ قرآن مجید و فرقان حمید فضائل جہاد سے بھرا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ سورۂ توبہ میں جابجا ارشاد ہے اور احباب سے امید ہے کہ انتظار نامہ و پیام نام بہ نام جداگانہ نہ کریں۔ صرف اس اعلام کو کافی و وافی بوجھ کر ہر صاحب اپنے ملاقاتی و احباب سے ارشاد کردیں۔

غیبی سامان

اور جہاد میں بڑا سامان یہ ہے کہ بندے توکل بہ خدا کریں اور امداد جانب خالق کون و مکان سے ہو۔ سو امداد غیبی صریح ظاہر و باہر کہ مسلمان ہندوستان کے بہ سبب بے استطاعتی زر و عدم موجودگی گولہ و باروت و توپ و لشکر مجبور و ناتواں ہو رہے تھے۔ سو اس خالق اللہ الصمد نے دین احمد صلعم کو جیسا باطنا قوی و توانا کیا ہے، ویسا ہی ظاہراً ہے۔ سب سامان واسطے تسکین خاطر فاطر تم ضعفا مسکیناں اور امداد دین متین کے انھیں کفار نابکار نصاریٰ

بد اطوار سے بلا سبب وکوشش ہم لوگوں کے دلادیا۔

چنانچہ لشکر سوار و پیادہ و توپ و گولہ و باروت و زر کثیر خصوصاً قطعہ شقہ عطیہ حضرت فرمانروائے کشور ہند ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و عموماً امداد عساکر و افواج و میگزین جناب برجیس قدر ادام اللہ حشمتہم والی لکھنؤ سے اور ہمراہی تمام راجگان قلمرو لکھنؤ و راجگان قرب و جوار الہ آباد وغیرہ اور اخلاق و اتفاق سارے ہندوستان میں باوصف ہونے اختلاف اقوام و مذاہب کے۔

نصب العین سو یہ سب دلائل کامل و براہین مدلل کمربندی اوپر اندفاع اس قوم نصاریٰ طاغی و باغی کے ہے۔ مناسب ہے کہ جو بھائی مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنیں وہ فوراً مستعد ہو کر کمر ہمت جہاد باندھ لیں اور تا شہر الہ آباد تشریف لائیں اور قلعہ بند کفارِ نابکار کا قلع قمع کر کے بہ زور تیغ بے دریغ اپنی کے خاک میں ملا دیں اور باقی ماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں۔ پھر بہ اطمینان حکومت عدالت اسلام فرماویں۔[۱] آخر میں سورۂ توبہ سے چند آیات مع ترجمہ درج ہیں۔

غور طلب امور اب ملاحظہ فرمائیے، اس اشتہار میں انگریزوں کے ظلم و جور کیا تفصیل بتائی گئی ہے۔ غارت گری، آتش زدگی، قتل، پھانسی، مکان کھود ڈالنا، چھاپے مارنا، علماء و مشائخ کا خون بہانا، کلام اللہ، احادیث اور کتب فقہ کا جلانا۔

اسے الزام تراشی نہ سمجھیں بلکہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو جہاں موقع ملتا تھا، یہی کرتے تھے جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے مفصل حالات سے واضح ہو سکے گا۔ مجاہدین آزادی نے جو زیادتیاں کیں، ان میں سے بیشتر جوابی اور انتقامی تھیں۔ انگریز جن افسروں کی ستائش میں سرگرم رہے مثلاً نکلسن، نیل، ہاڈسن وغیرہ، ان کا وصف یہی تھا کہ وہ بڑے ہی سنگ دل، بے رحم، جابر اور ظالم تھے جہاں جاتے تھے، لوگوں کو اندھا دھند پکڑ پکڑ کر پھانسیوں پر لٹکا دیتے تھے۔

فتح پور کی جنگ افسوس کہ مولانا کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور مولانا کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد کی تسخیر کے بعد وہ کانپور پہنچ گئے تھے۔ نانا نے انگریزوں کے مقابلے کے لیے جوالا پرشاد کو اپنے

---

[۱] محاربہ اعظم صفحہ ۲۰۰-۲۰۱

مجاہدوں کے ساتھ فتح پور بھیجا تھا۔ ٹیکا سنگھ بھی ان کے ساتھ تھا۔ میلی سن لکھتا ہے:

> معلوم ہوتا ہے الٰہ آباد کا مولوی بھی اس موقع پر نانا کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ کرنیل ولیمز نے ایک گواہ کے بیانات چھاپے ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا جنگ فتح پور میں (مجاہدین آزادی کا) کمانڈر کون تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ٹیکا سنگھ جرنیل، الٰہ آباد کے مولوی اور جوالا پرشاد کو کمانڈری کی غرض سے جاتے دیکھا۔[1]

ایک اور بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ الٰہ آباد کا مولوی کان پور آیا تھا اور بخشی زین العابدین کے مکان پر ٹھہرا تھا۔[2]

حکیم احسن اللہ خاں کا بیان

حکیم احسن اللہ خاں کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ مجاہدین الٰہ آباد کے امیر مولوی لیاقت علی کی ایک عرضداشت آئی تھی، جس کا مضمون یہ تھا کہ میں دہلی روانہ ہونے والا ہوں تاکہ فوجی امداد لے کر واپس آؤں اور اس حصہ ملک کو یعنی الٰہ آباد اور گرد و نواح کو مخالفوں کے خرخشے سے پاک کر دوں اس عرضداشت کا کوئی جواب اس لیے نہ دیا گیا کہ مولوی صاحب خود آنے والے تھے:

> جب وہ آئے تو بخت خاں نے انھیں دربار شاہی میں پیش کیا۔ پھر وہ لکھنؤ کی گورنری کا فرمان لے کر واپس گئے۔ یہ فسادات شروع ہونے سے تین مہینے بعد کا واقعہ ہے۔[3]

یہ بیان حد درجہ عجیب اور سراسر ناقابل قبول ہے۔ وقت کے لحاظ سے یہ اواخر جولائی یا اوائل اگست کا واقعہ ہونا چاہیے۔ بے شک بخت خاں اس زمانے میں موجود تھا اور مولانا لیاقت علی کا آنا بھی سمجھ میں آ سکتا ہے، لیکن لکھنؤ کی گورنری کا پروانہ انھیں کیوں کر مل سکتا تھا جب کہ وہاں برجیس قدر موجود تھا؛ نیز کچھ مدت بعد برجیس قدر کا سفیر آ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا لیاقت علی کو کوئی پروانہ ملا تو وہ الٰہ آباد کی گورنری کا ہو گا۔ حکیم احسن اللہ خاں سے اس بارے میں بھول ہوئی۔

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۷۳۔ [2] فوجی ریکارڈز

[3] مقدمہ بہادر شاہ صفحہ ۲۶۵۔

ایک اور بات تعجب انگیز ہے اور وہ یہ کہ مولانا تو فوجی امداد کے طلب گار تھے تاکہ جاکر جنگ کریں۔ وہ گورنری کے پروانے کو لے کر کیا کرسکتے تھے، درآنحالیکہ الہ آباد پر انگریز قابض ہو چکے تھے؛ محض پروانہ تو مولانا کو کوئی ملک نہ دلا سکتا تھا۔

بعد کے حالات

مفتی انتظام اللہ نے لکھا کہ مولانا لیاقت علی الہ آباد سے رخصت ہو کر لکھنؤ چلے گئے[1] ظاہر ہے کہ یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا الہ آباد سے کان پور پہنچے۔ پھر انھوں نے نانا کی فوج کے ساتھ ہو کر فتح پور میں انگریزوں سے جنگ کی۔ بعد ازاں دہلی گئے اور مجھے یقین ہے کہ بخت خاں کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔

جب تک لکھنؤ میں مقابلے کی صورتیں باقی رہیں، وہیں ٹھیرے رہے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی معیت کہیں مذکور نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ سے وہ نیپال چلے گئے تھے۔ نیپال سے حکومت نے چند افراد کے سوا سب کو واپس کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا لیاقت علی بھی گرفتار ہو کر آئے، مقدمہ چلا اور انڈیمان بھیج دیے گئے۔ وہاں پہنچنے سے کچھ دن بعد انتقال ہوا۔[2] گویا دینی حمیت، ایمانی غیرت اور حبِ آزادی کا یہ گوہر گرانمایہ بھی انڈیمان ہی کی آغوش میں محوِ خواب ہے۔

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۱۔

تانتیا ٹوپے

ابتدائی حالات

تانتیا کے والد کا نام پانڈورنگ تھا۔ یقیناً وہ باجی راؤ ثانی کے خاص آدمیوں میں سے ہوگا کہ ساتھ ہی بٹھور پہنچا اور زندگی کے باقی اوقات باجی راؤ کے ساتھ ہی گزار دیے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب وفات پائی۔

پانڈورنگ کا اصل وطن پرگنہ جولا، ضلع پٹودہ (علاقہ ناسک) تھا، جیسا کہ خود تانتیا نے اپنے بیان میں بتایا۔ لیکن بٹھور میں مستقل قیام کی وجہ سے وطن کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رہا ہوگا، لہٰذا تانتیا نے اپنا مسکن و موطن بٹھور ہی بتایا۔

تاریخ پیدائش کہیں مذکور نہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں گرفتاری کے بعد تانتیا نے جو بیان مرتب کیا تھا، اس میں اپنی عمر پینتالیس سال بتائی تھی۔ اس بناء پر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء یا ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوا۔ میلی سن نے قیاساً ۱۸۱۲ء بتائی ہے۔ اس وقت پیشواؤں کی مسند حکمرانی محفوظ تھی اگرچہ اس پر زوال کے اسباب برساتی گھٹاؤں کی طرح چھا چکے تھے۔ دو تین سال بعد یہ مسند بھی انگریزوں کی حرص اقتدار پر قربان ہو گئی جس طرح اس وسیع ملک کی دوسری مسندیں قربان ہو چکی تھیں یا قربان ہونے والی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تانتیا کی تربیت بٹھور ہی میں ہوئی اور غالباً باجی راؤ نے اسے نانا کا مصاحب بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو نانا کا مصاحب یا ایڈیکانگ ہی بتایا ہے۔[1]

۱۸۵۷ء

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ تانتیا نے کہاں تعلیم پائی اور وہ کیا کچھ جانتا تھا؟ فنون جنگ کہاں سیکھے اور ان میں مشق کس مقام پر بہم پہنچائی؟ تاریخ اُس کے نام سے صرف اس وقت روشناس ہوئی، جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔

تانتیا نے کان پور میں اس جنگ کے آغاز کا جو نقشہ تیار کیا، اُسے ہم نانا کے حالات میں پیش کر چکے ہیں،

---

[1] میلی سن کی کتاب جلد پنجم میں تانتیا کا بیان بطور ضمیمہ شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۳۰۴ - ۳۱۰۔

اُسے دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ تانتیا کے نزدیک :

۱- جنگ کے محرکین میں نہ تھا، بلکہ اُسے سرکش سپاہیوں نے مجبور کر کے ساتھ ملایا تھا۔

۲- کان پور میں انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیے تو کشتیوں میں سوار کرا چکنے کے بعد بھی جو دردناک حالات پیش آئے، اس کے ذمہ دار سپاہی تھے نہ کہ نانا یا خود تانتیا یا دوسرے لوگ۔ سپاہی کسی کی بات سُننے کے لیے تیار نہ تھے۔

۳- جب یہ خبر ملی کہ انگریزی فوج الہ آباد سے فتح پور تک پہنچ گئی ہے تو سپاہیوں نے نانا کو ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ نہ گیا البتہ اپنے خاص مشیر جوالا پرشاد کو فوج کے ساتھ بھیج دیا۔

۴- فتح پور میں شکست کھانے کے بعد فوج واپس ہوئی۔ پھر کان پور کے لیے جنگ پیش آئی۔ وہاں بھی شکست ہی سے سابقہ پڑا۔

بٹھور سے روانگی

کان پور پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بٹھور میں ٹھہرے رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ نانا، بالا صاحب، راؤ صاحب اور تانتیا مع اہل و عیال وہاں سے نکلے اور دریا عبور کر کے فتح پور پہنچ گئے جو اودھ کے علاقے میں تھا اور وہاں چودھری بھوپال سنگھ نام ایک شخص کے پاس مقیم رہے۔ چند روز کے بعد اطلاع ملی کہ ۴۲ دیسی فوج شبو راج پور پہنچ گئی ہے۔ اُس نے نانا کو لکھا کہ کسی اعتمادی آدمی کو ہمارے پاس بھیج دیجیے۔ نانا نے تانتیا ہی کو بھیجا۔ چنانچہ تانتیا اس فوج کو لیکر بٹھور گیا۔ وہاں پھر انگریزی فوج سے لڑائی ہوئی، شکست کھائی اور وہ دوبارہ نانا سے جا ملا۔

نانا سے علیحدگی

مزید چند روز گزر گئے تو نانا نے تانتیا کو حکم دیا کہ گوالیار چلے جاؤ اور وہاں سے جتنی فوج مل سکے لے کر انگریزوں سے جنگ کرو۔ چنانچہ تانتیا اس حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، اس کے بعد نانا سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ تانتیا الگ لڑتا رہا، نانا لکھنؤ میں ٹھہرا رہا۔ پھر وہ احمد اللہ شاہ اور حضرت محل کے ساتھ شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا۔ بعد ازاں نیپال پہنچ گیا۔

کان پور میں جنگ

تانتیا نے گوالیار کی چھاؤنی سے خاصی فوج ساتھ لی۔ اس کا ایک حصہ کالپی میں چھوڑا، باقی فوج کے ساتھ دریائے جمنا عبور کر کے کان پور پر حملہ کیا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ انگریزی لشکر کے دو جرنیل ہیوے لاک اور آوٹ رم لکھنؤ میں محصور بیٹھے تھے۔ کالن کیمبل سپہ سالار نے ونڈھم[1] کو کان پور میں چھوڑ کر خود لکھنؤ کی طرف گیا تھا۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے

---

[1] WINDHAM

بہترین تدبیر یہ تھی کہ تانتیا نے جس طرح جمنا کو عبور کیا تھا اسی طرح چپ چاپ گنگا کو عبور کر کے اودھ میں داخل ہو جاتا اور کالن کیمبل پر عقب سے حملہ کرتا لیکن اس نے یہ مناسب سمجھا کہ ونڈھم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کان پور پر قابض ہو جائے پھر کالن کیمبل کے خلاف پیش قدمی کرے۔

یہ سکیم بھی بڑی اچھی تھی۔ تانتیا نے بڑی سرگرمی سے ونڈھم پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں کالن کیمبل نے انگریز محصورین کو بیلی گارد سے نکال کر عالم باغ میں ٹھہرایا، عورتوں، بچوں اور زخمیوں کو لے کر وہ کان پور واپس ہوا اس لیے کہ اندیشہ تھا، مبادا ونڈھم پر حملہ ہو جائے اور وہ کسی بڑی فوج کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

گیارہ روز کے جدال و قتال کے بعد تانتیا ٹوپی کان پور سے مراجعت پر مجبور ہو گیا۔ وہ پہلے گنگا کو عبور کر کے کھڑا ہیں رہا، پھر راؤ صاحب کے حکم سے کالپی چلا گیا، جہاں بالا صاحب پہلے سے مقیم تھا۔

چرکھاری پر یورش

وسط ہند میں باندا سے ذرا جنوب کی طرف چرکھاری نام ایک ریاست تھی۔ تانتیا کالپی پہنچا تو نانا کی طرف سے اس کے نام حکم آگیا کہ چرکھاری پر حملہ کرو، اس لیے کہ وہاں کا راجا انگریزوں کا وفادار تھا اور اسے جلد سے جلد ختم کر دینا حد درجہ ضروری تھا۔ چنانچہ تانتیا نے فوراً چرکھاری پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ اس وقت تانتیا کے ہمراہ نو سو سپاہی، دو سو سوار اور چار توپیں تھیں۔ راجا محصور ہو گیا۔ گیارہ روز کے بعد چرکھاری کی حوالگی عمل میں آئی۔ تانتیا کو راجا سے چوبیس توپیں اور تین لاکھ روپے ملے۔ اسی زمانے میں آس پاس کے بعض راجے تانتیا کے ساتھ مل گئے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ سر ہیوروز جھانسی سے صرف چودہ میل کے فاصلے پر تھا۔ جب اسے حکم ملا کہ چرکھاری جاؤ اور فرمانبردار راجا کو دشمنوں سے بچاؤ۔ چرکھاری ہیوروز سے اسّی میل دور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسّی میل کا فاصلہ طے کرنے تک چرکھاری مقابلہ نہ کر سکے گا اور اس اثنا میں جھانسی کو محصور کر لینے کا منصوبہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نے حکم نہ ماننے کی بھاری ذمہ داری قبول کر لی، لیکن وہ قدم نہ اٹھایا جو فوجی نقطۂ نگاہ سے غلط تھا اور اپنے تیار کیے ہوئے نقشے پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جھانسی کی تسخیر نے چرکھاری کے لیے بھی کشایش کا راستہ پیدا کر دیا۔

مطلب یہ کہ بڑے بڑے انگریز سپہ سالار بھی حد درجہ غیر مآل اندیشانہ طرز عمل پر کاربند ہوئے لیکن قابل اور فہیم ماتحت افسروں نے ان حرکتوں کو عام صورت حال پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔

جھانسی کی امداد

ادھر چرکاری مسخر ہوا ادھر سر ہیوروز جھانسی کا محاصرہ کر چکا تھا۔ رانی لکشمی بائی نے امداد

کے لیے لکھا تو تانتیا نے راؤ صاحب کو اطلاع دی جو کالپی پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے حکم آیا کہ رانی کی امداد ضرور کرنی چاہیے چنانچہ تانتیا جھانسی کی جانب روانہ ہؤا۔ اس کے پاس چوبیس ہزار جنگجو اور اٹھائیس توپیں تھیں۔ یہ بہت بڑی قوت تھی جس سے کام لے کر ہیو روز کو بہ آسانی کچلا جاسکتا تھا لیکن جیسا کہ ہم رانی لکشمی بائی کے حالات میں بیان کر چکے ہیں، یہ فوج کچھ نہ کر سکی اور تھوڑی ہی دیر میں شکست کھا کر بھاگی۔ یہ یکم اپریل ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ اس شکست نے نہ صرف جھانسی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا بلکہ وسط ہند میں جنگ آزادی کے مقاصد کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔

جنگ کونچ شکست کے بعد تانتیا کی فوج کا ایک حصہ چار پانچ توپیں لے کر جھانسی سے کالپی چلا گیا اور وہ خود دو سو سپاہیوں کے ساتھ چکر لگاتا ہؤا کالپی پہنچا۔ اس اثناء میں رانی لکشمی بائی بھی جھانسی کھو کر کالپی میں وارد ہو چکی تھی۔ اس نے جاتے ہی راؤ صاحب سے درخواست کی کہ مجھے فوج دیجیے تاکہ انگریزوں سے لڑوں۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ پھر تانتیا سے کہا کہ رانی کے ساتھ جنگ کے لیے جاؤ۔ تانتیا نے کالپی اور جھانسی کے درمیان کونچ میں لڑائی کا فیصلہ کیا تھا اور وہاں استحکامات بھی کر لیے تھے، لیکن سر ہیو روز کے مقابلے میں شکست کھائی اور وہ اپنے والدین سے ملنے کے لیے چرکی چلا گیا۔ رانی دوبارہ کالپی پہنچی، وہاں انگریزوں سے جنگ کی۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اسی نے تجویز پیش کی کہ گوالیار پہنچ کر وہاں کی فوج سے آزادی وطن اور دھرم کے نام پر اپیل کرنی چاہیے۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ تانتیا نے کونچ سے پیچھے ہٹتے ہی گوالیار کا رخ کر لیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں کو انگریزوں کے مقابلے کے لیے تیار کر دے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

مرار اور کوٹہ کی سرائے رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب اور نواب باندہ گوالیار پہنچے۔ سندھیا نے روکنا چاہا۔ فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بھاگ کر بمشکل انگریزوں کے پاس آگرہ پہنچا۔ گوالیار مجاہدین آزادی کے قبضے میں آگیا۔ یہاں انگریزوں سے ایک لڑائی مرار میں ہوئی اور دوسری کوٹہ کی سرائے میں۔ دونوں جگہ انگریز کامیاب ہوئے۔ رانی لکشمی بائی ماری گئی اور تانتیا نے راجپوتانہ کا رخ کر لیا۔ ۱۹۔ جون ۱۸۵۸ء کو جوڑا علی پور میں شکست کھانے کے بعد کم و بیش نو مہینے تک تانتیا مسلسل بھاگا دوڑا پھرتا رہا۔

فرار اور تعاقب اس دوران میں اس نے راجپوتانہ، وسط ہند اور گجرات تک چکر لگائے۔ ان مقامات

کے محض نام بھی بتائے جائیں تو پورا صفحہ بھر جائے۔ چند بڑے بڑے مقامات یہ ہیں: ٹونک، اندر گڑھ، کوٹرا، بوندی، نصیر آباد، سانگانیر، پھر کوٹرا، کنکرولی، ناتھ دوارہ، جھالرا پٹن، بھیل واڑہ، راج گڑھ، سرونج، عیسی گڑھ، چندیری، منگرولی، جکلاؤں، سلطان پور، ناگ پور، ہوشنگ آباد، راج پورہ، چھوٹا اودے پور، بانسواڑہ، اودے پور، پرتاپ گڑھ، زیرا پور، ناہر گڑھ، پیرون، دوبارہ، اندر گڑھ، دیواسا، سیکر، نروار۔

اس بھاگ دوڑ میں کچھ مدت تک راؤ صاحب اس کے ساتھ رہا۔ شہزادہ فیروز شاہ نے بھی تھوڑی مدت کے لیے اس کی معیت اختیار کیے رکھی۔ مختلف مقامات پر جھڑپیں یا لڑائیاں ہوتی رہیں۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں بمقام سیکر (ریاست جے پور) آخری بڑی لڑائی ہوئی اور مجاہدین نے شکست کھائی۔

عزیمت اور منصوبے

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ تانتیا نے ہمت بالکل نہ ہاری۔ جب اس نے وسط ہند سے جنوب کا رُخ کیا تھا تو اس کا ارادہ یہ تھا کہ مرہٹوں کی آبادیوں میں پہنچ کر ان کی قومی غیرت و حمیت سے اپیل کرے اور انگریزوں کے خلاف اٹھا دے۔ لیکن انگریز اس وقت تک ہندوستان کے مختلف حصّوں پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے متعدد جیش تانتیا کے گرد و پیش جگہ جگہ متعین کر دیے تھے، جنھوں نے تانتیا کو دو چار روز بھی کہیں اطمینان سے بیٹھنے اور منصوبوں کو جامہ عمل پہنانے کا موقع نہ دیا۔ اس کی گرفتاری کا واقعہ بڑا ہی عبرت افزا اور رنج دہ ہے جو تھوڑی سی تمہید کا متقاضی ہے۔

مان سنگھ

گوالیار کا ایک ماتحت رئیس مان سنگھ تھا، جو کسی معاملے پر مہاراجا سندھیا سے بگڑا اور بغاوت کی ٹھان لی۔ سندھیا کا مقابلہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اہل و عیال اور متعلقین کو لے کر جنگل میں جا بیٹھا اور انگریزوں کے مخالفوں سے ساز باز شروع کر دیا۔ جس زمانے میں تانتیا ٹوپے نے چرکھاری پر قبضہ کیا تھا تو دوسرے امراء کے علاوہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ انگریزوں کو اعتراف تھا کہ جنگل میں اسے گرفتار کرنا آسان نہیں۔ یہی شخص تھا جس کے پاس دوستی کی بناء پر تانتیا نے پناہ لی اور اس پر بھروسا کیا، یہی شخص تھا جس نے اپنی سابقہ حیثیت بحال کرانے کے لالچ میں اس عزیز دوست اور اس مجاہد آزادیِ وطن کے ساتھ بے وفائی کر کے اسے گرفتار کرایا۔

انگریزوں کا منصوبہ

جو فوج تانتیا ٹوپے کے تعاقب کے لیے مقرر تھی اس کا سالار رابرٹ نیپئر تھا، جو بعد میں لارڈ نیپئر آف میگڈالا بنا اور افواج ہند کا سپہ سالار اعظم بھی رہا۔ اس

نے یہ منصوبہ سوچا کہ جب تک مان سنگھ کو کسی ذریعے سے ساتھ نہ ملایا جائے گا تانتیا کی گرفتاری عمل میں نہ آسکے گی۔ چنانچہ اس نے مختلف آدمیوں کے ذریعے سے مان سنگھ کے ساتھ روابط پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کرلیں۔ سندھیا کو اس بارے میں ہم نوا بنالینا ہرگز مشکل نہ تھا۔ وہ تو اپنی قسمت انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا۔ جس افسر کو اس کام پر مامور کیا گیا اس کا نام "میڈ"[1] تھا۔

گرد و پیش کے حالات کی چھان بین کرتے ہوئے دریافت ہو چکا تھا کہ مان سنگھ کے علاقے میں نرائن سنگھ نام ایک ٹھاکر رہتا ہے جس پر مان سنگھ کو پورا بھروسا ہے اور آس پاس بھی اس کا خاصا اثر ہے۔ میڈ نے اس ٹھاکر سے بات چیت کی اور اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ مان سنگھ کو حوالگی پر راضی کر دے، اسے ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچنے دیا جائے گا۔ نیز مان سنگھ کے مشیر خاص یا دیوان کو ساتھ لے آئے تاکہ حکومت کی طرف سے اسے بھی یقین دلا دیا جائے اور مفصل بات چیت ہو جائے۔

دیوان سے ملاقات

۱۱- مارچ ۱۸۵۹ء کو میڈ نے دیوان سے ملاقات کی۔ کہا جاتا تھا کہ مان سنگھ صرف اس کی بات مانے گا۔ میڈ نے اسے پورا اطمینان دلا دیا۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر مان سنگھ کے اہل و عیال انگریزی کیمپ میں آجائیں گے تو ان کی عزت و حرمت بحال رہے گی۔ دربار گوالیار کے آدمیوں کو ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ انھیں تنگ کریں۔ کھانے پینے کا بڑا اچھا انتظام کر دیا جائے گا۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مان سنگھ واپس آجائے تو اسے بھی کوئی آزار نہ پہنچے گا۔ بالآخر میڈ نے یہ تمام وعدے لکھ کر دیوان کے حوالے کر دیے۔

مان سنگھ کی حوالگی

دیوان نے مان سنگھ سے بات چیت کی اور اسے حوالگی پر آمادہ کر لیا۔ سب سے پہلے وہ مان سنگھ کے اہل و عیال اور نوکروں چاکروں کو لے آیا۔ یہ کوئی ستّر آدمی ہوں گے۔ میڈ نے انھیں بہ حفاظت مان سنگھ کے ایک گاؤں میں بھیج دیا جو سیپری کے قریب واقع تھا اور ان کے لیے تمام ضروری انتظامات کر دیے۔ یہ دراصل مان سنگھ کی حوالگی کا پیش خیمہ تھا۔ ممکن ہے وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کے متعلقین سے کیسا سلوک کیا جاتا ہے اور پورے اطمینان کے بعد آنا چاہتا ہو۔ جب اس پر واضح ہو گیا کہ سب کچھ حسب مراد ہو رہا ہے تو ۲- اپریل ۱۸۵۹ء کو وہ خود بھی انگریزی

---

[1] MEADE.

کیمپ میں آیا۔ تاہم اس وقت تک اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ انگریزوں نے جو جال بچھا رکھا ہے، وہ کیا ہے اور اسے اپنی انسانیت کو پستی کی کس گہرائی میں پہنچانا پڑے گا یعنی وہ سمجھتا تھا کہ صرف میری سرکشی ختم کرنی منظور ہے، یہ معلوم نہ تھا کہ اسے ناتیا کی گرفتاری کے لیے ٹھیکے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

مان سنگھ پر ڈورے

اب مان سنگھ پر ڈورے ڈالے جانے لگے۔ اسے یقین دلایا گیا کہ جان یا آبرو کو کوئی بھی ضرر نہ پہنچے گا لیکن مال کے متعلق کوئی وعدہ نہ تھا۔ اب مختلف کارکنوں[1] کے ذریعے سے اس کے سامنے عجیب و غریب ترغیبیں پیش ہونے لگیں، مثلاً یہ کہ وہ بہت بڑا امیر تھا، راجاؤں میں شمار ہوتا تھا، سیکڑوں متوسلین ہیں، جب تک جاگیر نہ ملے گی، ان سب کا گذارہ کیوں کر چلے گا اور خود وہ اپنی حیثیت کیوں کر بحال رکھ سکے گا؟ شروع میں تو مان سنگھ کچھ سمجھا ہی نہیں کہ مدعا کیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے بھی پرانی ریاست کے خواب آنے لگے۔ سب کارندے یہی کہتے کہ جب تک کوئی نمایاں خدمت انجام نہ دو گے، ریاست واپس ملنے کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ ۲- اور ۳- اپریل کو خود میڈ نے اس سے مفصل باتیں کیں۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ مان سنگھ کا چچا، جو اسی کی طرح گھر بار چھوڑ کر جنگل میں بیٹھا تھا، ایک خاص جگہ موجود ہے۔ مان سنگھ خود فوج کے ساتھ ہو کر اسے پکڑوانے کے لیے تیار ہو گیا۔

گویا انگریزوں کا جادو چل گیا۔ جو شخص اپنے حقیقی چچا کو پکڑوانے کے لیے تیار ہو چکا تھا، اس کے لیے ایک ایسے شخص کو پکڑوا دینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا جس کے ساتھ خون یا خاندان یا نسل کا کوئی بھی رشتہ نہ تھا۔

مان سنگھ کے چچا کو بروقت اطلاع مل گئی اس لیے کہ اس کے اور خود مان سنگھ کے جاسوس انگریزی لشکر میں موجود تھے۔ مان سنگھ کو اس کے بچ نکلنے پر سخت تاسف ہوا۔ میلی سن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

> یہ تذلیل و افتادگی کی طرف پہلا قدم تھا ——— کہنا چاہیے کہ یہ زیادہ تذلیل و افتادگی کی تمہید تھی[2]

---

[1] ان میں سے ایک مسمیٰ پر بھولال کا ذکر میلی سن نے کر دیا ہے۔ جلد پنجم صفحہ ۲۶۳۔

[2] جلد پنجم صفحہ ۲۶۲۔

بدبخت مان سنگھ

اب مان سنگھ کی صرف ایک آرزو تھی اور وہ یہ کہ جلد سے جلد تانتیا کو گرفتار کرا کے اپنی ریاست یا جاگیر بحال کرالے۔ اسے تاخیر میں یہ اندیشہ نظر آتا تھا کہ ممکن ہے تانتیا کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ اس اثناء میں تانتیا نے مان سنگھ کے ذریعے سے قاصد بھیج کر ساتھیوں کا حال دریافت کر لیا تھا اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ آٹھ نو ہزار آدمی سرونج کے جنگل میں موجود ہیں۔ راؤ صاحب الگ ہو چکا ہے لیکن شہزادہ فیروز شاہ، نواب عادل محمد اور امام علی وردی میجران آدمیوں کے ساتھ ہیں۔ امام علی نے تانتیا کو ایک خط بھی بھیجا تھا کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہ خط ۵۔ اپریل کو ملا تھا۔ گویا اگر مان سنگھ غداری پر آمادہ نہ ہو جاتا تو اغلب تھا تانتیا فوج سے جا ملتا۔ سوال یہ نہیں کہ اس حالت میں وہ سب کچھ کر سکتے یا نہ کر سکتے، تاہم تانتیا کے بچ نکلنے کی صورتیں تو ضرور موجود تھیں۔

اگرچہ تانتیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ مان سنگھ انگریزوں سے مل گیا ہے، تاہم اسے پورا یقین تھا کہ دوست ہے اور وہ کسی بھی حالت میں دھوکا نہ دے گا۔ تانتیا نے اپنا مامن بھی مان سنگھ کے مقرر کیے ہوئے آدمی کی رائے کے مطابق تجویز کیا تھا۔ مان سنگھ نے اسے تاکید کر دی تھی کہ جہاں یہ شخص تمھیں لے جائے وہیں ٹھہر جانا۔

حوالگی

مان سنگھ سارے فیصلے کر چکنے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں دو تین روز میں آؤں گا۔ اس اثناء میں وہ تانتیا کے پاس پہنچا ہو گا، اسے اطمینان دلایا ہو گا کہ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے ٹھہرے رہو، تمھیں کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

خود تانتیا نے لکھا ہے کہ مان سنگھ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے پیشتر مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ دو تین روز میں آؤں گا۔ واپس آیا تو دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس میں یہ ذکر بھی کیا کہ میڈ کی نیت بہ خیر معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کیا مشورہ دیتے ہو۔ چلا جاؤں یا یہیں ٹھہرا رہوں۔ اس نے کہا کہ صبح اس سوال کا جواب دوں گا۔

تانتیا کا اعتماد ملاحظہ ہو کہ مان سنگھ کی حوالگی پر بھی اس کے متعلق شبہ پیدا نہ ہؤا۔ اس کے برعکس بدبخت مان سنگھ کی کمینگی دیکھیے، پہلے تانتیا کو یہ چکمہ دینے کی کوشش کی کہ میڈ کے پاس چلے چلو تو تمھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ جب دیکھا کہ تانتیا اس قسم کی باتوں پر متوجہ نہیں ہو سکتا تو اسے یہ کہہ کر سلا دیا کہ صبح فیصلہ کریں گے اور اسی رات پکڑوا دیا۔

گرفتاری کی کیفیت یہ ہے کہ ۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء کو آدھی رات کے وقت مان سنگھ تانتیا کے مامن پر پہنچا پیچھے پیچھے فوج کے آدمی تھے۔ تانتیا کو سوتے میں جا پکڑا اور اسی وقت میڈ کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۸۔ اپریل کو صبح کے وقت کیمپ میں پہنچ گئے۔

بے شک مان سنگھ کو غداری کے بدلے میں جاگیر مل گئی لیکن وہ جب تک زندہ رہا ہوگا، اس جاگیر کا ایک ایک ذرّہ تانتیا ٹوپے کے خونِ ناحق کا پیغامی بنا رہا ہوگا اور اسے ۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء کی غداری یاد دلاتا رہتا ہوگا۔ ایک طرف تانتیا تھا جس نے آزادیٔ وطن کے لیے جان کی بازی لگائی اور جان دے دی۔ دوسری طرف مان سنگھ تھا جس نے ایک چھوٹے سے اور بالکل غیر معروف قطعہ اراضی کے لیے دوستی، شرافت، انسانیت ہر ایک کو بے پروائی سے قربان کر دیا۔ لوگوں نے میر جعفر اور میر صادق کو مثالی غدار بنا لیا۔ دلی کا میرزا الٰہی بخش اور گوالیار کا مان سنگھ بھی اسی درجے میں رکھے جانے کے مستحق ہیں۔

مقدمہ تانتیا کو بتاریخ ۸۔ اپریل سیپری لے گئے، جو گوالیار سے ٹونک جانے والی سڑک پر ایک مشہور مقام ہے اور یہ مان سنگھ کی جاگیر کا ایک حصہ تھا۔ وہاں اُس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اُس پر صرف ایک الزام تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کی۔ اس کا جواب نہایت سادہ اور واضح تھا یعنی:

> میں نے کالپی پر قبضے تک تمام امور میں اپنے آقا و مالک ناناصاحب کے احکام کی تعمیل کی۔ بعد ازاں راؤ صاحب کے احکام مانتا رہا۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا الّا یہ کہ فرنگی مردوں، عورتوں یا بچّوں کے قتل سے مجھے کوئی سروکار نہیں اور نہ میں نے کبھی کسی کو پھانسی کا حکم دیا۔[۱]

بیان کی حیثیت تانتیا کا یہ بیان یقینی اور قطعی طور پر درست تھا۔ اس سلسلے میں چند حقائق پیشِ نظر رکھ لیجیے:

۱۔ تانتیا ٹوپے کی طرح ہر مرہٹے کے نزدیک صرف باجی راؤ اور اس کے اخلاف ہی حکمرانی کے مجاز تھے اور ان کے احکام کی تعمیل ہر حال میں ضروری تھی۔

۲۔ تانتیا باجی راؤ کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔

---

[۱] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۶۴۔

۳- میلی سن کے بیان کے مطابق انگریزوں کو وہ اجنبی سمجھتا تھا جنھوں نے مرہٹوں کی سلطنت چھین لی تھی۔

۴- یقیناً تانتیا نے کسی بھی انگریز کے قتل میں حصہ نہ لیا اور نہ کسی کو پھانسی پر لٹکانے کی سزا دی۔ ستی چوڑا کے گھاٹ کا قتل سپاہیوں کا کام تھا، جو نانا یا تانتیا یا کسی کی بات سننے پر آمادہ نہ تھے۔ دوسرے حکم قتل کا اگر کوئی ذمہ دار ہو سکتا تھا تو وہ نانا تھا نہ کہ تانتیا۔

سزا اور اُس کا نفاذ

فوجی عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنائی اور ۱۸- اپریل کو سیپری میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس بارے میں ہم خود کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ صرف میلی سن کا بیان درج کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> وقت کی رائے عامہ نے اس سزا کے منصفانہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ شاید آیندہ نسلیں اس کی درستی میں شک کریں گی۔ تانتیا ٹوپے انگریزی حکومت کے دائرے میں پیدا نہ ہوا تھا اور نہ اس کا ماتحت تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت ۔ جو غالباً ۱۸۱۲ء میں ہوئی اس کا آقا مغربی ہند کے ایک بہت بڑے حصے کا خود مختار حکمران تھا۔ اس کے لیے قطعاً عجب نہ تھا کہ اس قوم کی خدمت خلوص و وفاداری سے انجام دے جس نے اس کے آقا کو سلطنت سے محروم کیا تھا۔ جب اس کے آقا نے جو انگریزوں کے ساتھ کسی بھی رشتے سے وابستہ نہ تھا، پیشوا کے علاقے واپس لے لینے کا موقع دیکھا تو تانتیا نے بھی مصاحب کی حیثیت میں اس کے احکام کی تعمیل کی اور اس کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ میں کسی قتل کا مرتکب نہ ہوا اور اس پر ایسا کوئی الزام لگایا بھی نہ گیا۔ سابق پیشوا کے خاندان کا ایک متوسل ہونے کے باوجود اس پر انگریزوں کے خلاف جنگ کا الزام عائد کیا گیا اور اسی الزام کی بنا پر اسے مجرم قرار دے کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔[1]

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۱۶ +

تاہم اسے کیا کیا جائے کہ انگریزوں پر وحشت سوار تھی، وہ خون کے پیاسے تھے اور اندھا دھند موت کی سزائیں دینے پر تلے بیٹھے تھے۔ تانتیا ٹوپے کا خون بھی ہمارے نزدیک خونِ ناحق تھا۔

شخصیت

تانتیا کی شخصیت کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً وہ کوئی بڑا جرنیل نہ تھا۔ اُس نے کسی بھی جنگ میں اپنی سپہ گری کے جوہر نہ دکھائے۔ جھانسی کے سامنے اس کے ساتھ بائیس ہزار جنگجو تھے جو ایک ہلّے میں انگریزی فوج کا قلع قمع کر سکتے تھے، لیکن وہاں بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ بے شک سپاہی اچھے نہ تھے لیکن اچھے سپہ سالار معمولی سپاہیوں سے بھی اعلیٰ کام لیتے رہے ہیں۔

انگریزوں نے جھانسی اور کوپخ سے اس کی مراجعت کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ جوڑا علی پور کی شکست کے بعد گرفتاری تک اُس نے راجپوتانہ اور مالوہ کے ایک یا دو دفعہ سے زیادہ دفعہ چکر لگایا اور یہ علاقہ ایک لاکھ اکسٹھ ہزار سات سو مربع میل ہے۔ تاہم اُس نے ایسا کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جس میں اس کی ممتاز حیثیت نمایاں ہوتی۔ رانی لکشمی بائی بھی ناکام رہی، کامیاب نہ ہو سکی، لیکن وہ جہاں لڑی، اس مردانگی سے لڑی کہ دشمن بھی اعتراف پر مجبور ہو گئے۔

تانتیا کی عظمت اس کے خاص جوہروں میں نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کے لیے جان کی بازی لگانے میں ہے۔

یہ شرف بھی بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے کہ کسی بلند نصب العین کے قدم اٹھائیں تو آخری سانس تک روگردانی نہ کریں۔

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں

تمہید ان دونوں بزرگوں کے حالات یکجا بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آزادی کے جہاد میں ان دونوں نے اکٹھے کام کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اول ایک مذہبی مجاہدے میں یہ رفیق تھے، دوسرے جب جنگ آزادی ناکامی پر منتج ہوئی تو دونوں یکے بعد دیگرے حجاز پہنچ گئے اور باقی زندگی اسی مقدس سرزمین میں پوری کرکے مالک حقیقی سے جا ملے اور دونوں کے متعلق زیادہ تر حالات اسی دور کے متعلق ملتے ہیں جب انھوں نے اکٹھے کام کیا۔

مولانا رحمت اللہ مولانا کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، اس لیے کیرانوی مشہور ہوئے، والد کا نام مولوی نجیب اللہ، اجداد کا اصل وطن پانی پت تھا، جہاں ان کی خاصی جائداد بھی تھی۔ یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمٰن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے اخلاف میں سے ایک صاحب مولانا محمد عارف الاسلام مخدوم جلال الدین کبیر اولاولیا کو اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی پیدائش ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی، پھر دہلی چلے گئے، جو اس زمانے میں علم وفضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درسگاہیں تھیں۔ مولوی محمد حیات کی درسگاہ میں شامل رہے جو لال قلعے کے پاس تھی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دہلی سے لکھنؤ جاکر مفتی سعد اللہ سے تکمیل علوم کی۔

مولانا کے والد میرٹھ میں میر منشی تھے۔ ۱۲۵۳ھ میں وہ اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ ملازمت چھوڑ کر وطن چلے گئے۔

ڈاکٹر وزیر خاں ڈاکٹر وزیر خاں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ ان کا اصل وطن بہار تھا۔ مدت تک مرشد آباد میں رہے۔ بعض لوگوں نے انھیں معمولی ڈاکٹر بتایا ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ یورپ گئے اور وہاں[1] ڈاکٹری کی بڑی ڈگری لی۔ نیز یونانی و عبرانی زبانوں میں معقول درک حاصل کیا[2]۔ تاکہ عیسائیت کے متعلق معلومات کے ہر ضروری ذریعے سے

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۳۰۔

براہ راست فائدہ اٹھا سکیں۔ پھر آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور تاج گنج کے محلہ کاغذیاں میں رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں "اکبر آبادی" لکھا گیا۔

یکساں ذوق اور دوستی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی کے علمی اور عملی ذوق میں یکسانی کے کئی پہلو تھے۔ مثلاً دونوں آزادی وطن کے شیدائی تھے، حسب موقع دونوں نے جنگ میں سرگرم حصہ لیا۔ دونوں کو عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور پادریوں کے ساتھ مناظروں میں ان کی شہرت دُور دُور پہنچ چکی تھی۔ اس وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلغ ہندوستان پہنچ گئے اور انھوں نے جگہ جگہ مشن قائم کر لیے۔ مقصود یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے۔ تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کر لیے گئے تھے۔ جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بہ کثرت چھاپ چھاپ کر نشر کی جاتی تھیں اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف حصص ملک کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر

۱۸۵۴ء میں یورپ سے فنڈر نام ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور وہ اکثر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلاواسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے۔ تورات، زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی اور نہ عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے اسی ضرورت کے پیش نظر عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات بہم پہنچائیں، جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں، پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچا لیا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ کو کیرانہ سے بلوا لیا۔ وہ دراصل فنڈر

کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں ٹھہرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ

رجب ۱۲۷۲ھ (مارچ ۱۸۵۶ء) میں مناظرے کا انتظام ہوا۔ چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں سے علماء، اُمراء اور عام لوگ آگرہ پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس تھے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ، مسلمانوں کی طرف سے مناظر اول مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولانا فیض احمد بدایونی بھی معاون تھے۔

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں:

> پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔ بحث و تمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں، لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے، اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا اور وہ آگرہ سے چلتا بنا۔[1]

غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سیکڑوں، ہزاروں مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے گہری واقفیت حاصل کر لی اور عیسائیوں یا دوسرے مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگِ آزادی

میرٹھ میں ہنگامہ بپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا گیا تھا۔ مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی، بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ نواح کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدین[2] کر رہے تھے لیکن تمام احکام مولانا رحمت اللہ ہی سے حاصل کیے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا، جس کی آواز

۱؎ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۳۱۔ ۲؎ معلوم ہوا کہ چودھری صاحب بھی بعد ازاں مولانا کے پاس حجاز چلے گئے تھے۔

سُن کر لوگ جمع ہو جاتے۔ پھر اعلان ہوتا "مُلک خدا کا حکم مولوی رحمت اللہ کا۔" اس کے بعد جو کچھ بتانا ہوتا بتا دیا جاتا۔

انگریزوں کی آمد

قریباً چار مہینے تک یہ سلسلہ اطمینان سے جاری رہا۔ پھر انگریزی فوج کیرانہ پہنچی۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپیں لگا دی گئیں اور مختلف گھروں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ چونکہ مولانا کی قیادت کا علم انگریزوں کو ہو چکا تھا، اس لیے انھیں کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ مولانا کو پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اپنے خاص رفیقوں کو لے کر پاس کے ایک گاؤں پنجیٹھ میں پہنچ چکے تھے۔ جب کیرانہ میں مولانا نہ ملے تو کسی مخبر نے پنجیٹھ کے بارے میں اطلاع دے دی کہ وہاں تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ انگریزی فوج نے پنجیٹھ کا رُخ کر لیا۔

مولانا کا بچاؤ

انگریزی فوج ابھی راستے ہی میں تھی کہ پنجیٹھ کے نمبردار نے مولانا کا عالمانہ لباس اتروایا، گھس کھدوں یا کسانوں کا لباس پہنایا، کھرپا ہاتھ میں دیا اور کھیت میں گھاس کھودنے کے لیے بٹھا دیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں جس کھیت میں گھاس کھود رہا تھا، انگریزی فوج اس کے ساتھ کی پگ ڈنڈی سے گزری۔ بلکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں، وہ میرے جسم کو لگ رہی تھیں۔
پنجیٹھ پہنچ کر ایک ایک گھر کی تلاشی ہوئی اور مولانا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ یوں مولانا بچ کر وطن سے نکلے۔ غالباً اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں نہ رہیں گے۔ تاہم کیرانہ سے باہر جانا سہل نہ تھا، اس لیے کہ ہر طرف دُور دُور تک انگریزوں کی عملداری تھی اور کہیں بھی وہ گرفتار ہو سکتے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ کا بیان

مولوی ذکاء اللہ دہلی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ باہر سے جو پلٹنیں ہتھیاروں کے بغیر آتی تھیں، انھیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے:

> مولوی رحمت اللہ اس تُوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے
> وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے
> وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی
> کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔
> وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔[1]

[1] ذکاء اللہ صفحہ ۶۷۵۔

غور طلب حقائق ظاہر ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہوگا جب دہلی میں مجاہدین کی خاصی تعداد مقیم تھی اور مقابلہ ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ مولانا نے اپنے ہاں جہاد کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ دہلی کے مرکز کی حالت دیکھیں، اُسے ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچائیں یا باہم مشورے سے تنظیمات کا بندوبست کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ علماء کرام کے نزدیک یہ ہنگامہ نہ جہاد تھا اور نہ اسے وہ نتیجہ خیز قرار دے سکتے تھے۔ وہ صحیح اصول و ضوابط کے مطابق انگریزوں سے لڑ کر انھیں نکالنا چاہتے تھے۔ یہ غرض نہ تھی کہ بے وجہ قتل و غارت کا طوفان اٹھا دیں۔

ہجرت مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے انھیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ بایں ہمہ انھوں نے کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے مصلح الدین نام اختیار کیا۔ خدا جانے کن غیر معروف راستوں اور کن بنجر علاقوں میں سے شقتیں اٹھاتے ہوئے گزرے اور سورت پہنچے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ستمبر ۱۸۵۷ء میں کیرانہ سے نکلے تھے۔ معلوم نہیں انھیں حجاز پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔

جائداد کی ضبطی ادھر حکومت نے جائداد کی ضبطی کا اعلان کر دیا۔ اس بارے میں مخبری کرنے والے شخص کا نام کمال الدین تھا۔ ۳۰۔ جنوری ۱۸۶۴ء کو مولانا کی ضبط شدہ قصباتی جایداد نیلام ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سرائے کھجور

۲۔ سرائے چوڑھے

۳۔ سرائے شیخ فضل الٰہی

۴۔ سرائے قصاباں

۵۔ سرائے لوہ آباد

۶۔ سرائے مایاں

ان کی قیمت لاکھوں روپے تھی لیکن یہ سب ایک ہزار چار سو بیس میں نیلام کر دی گئیں، زرعی زمینیں ان کے علاوہ تھیں[1]

---

[1] "الجمعیۃ" مورخہ ۱۰۔ دسمبر ۱۸۵۶ء

مجاہد ڈاکٹر

ڈاکٹر وزیر خاں آگرہ سے دہلی پہنچ گئے تھے اور جب تک جنگ جاری رہی، دہلی میں ٹھہرے رہے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کہا ہے:

> ایک فرمان کے ذریعے سے (بہادر شاہ نے) ڈاکٹر وزیر خاں کو اودھ کا گورنر بنایا تھا لیکن نہ ڈاکٹر صاحب دہلی سے گئے اور نہ انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا[1]

اگر یہ درست ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ فرمان بالکل ابتدائی دور میں جاری ہوا۔ جب برجیس قدر کی طرف سے باقاعدہ سفیر آگیا اور اودھ نے مرکز دہلی سے باقاعدہ تعلق پیدا کر لیا تو کسی نئے آدمی کو گورنر بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ رہی۔ برجیس قدر ہی کی حکومت پر منظوری کی مہر لگا دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب دہلی سے نہ گئے۔

ایک بیان مظہر ہے کہ جنرل بخت خاں نے ڈاکٹر صاحب کو آگرہ کا گورنر بنا دیا تھا۔

ہجرت

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں اس وقت دہلی سے نکلے جب انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ اور جنرل بخت خاں کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کب تک ٹھہرے رہے۔ جب امید کی کوئی بھی کرن باقی نہ رہی تو ہجرت کا مصمم ارادہ کر لیا۔ معلوم نہیں کن کن ذریعوں اور کن کن راستوں سے گئے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ مولانا رحمت اللہ کے بعد وہ بھی حجاز پہنچ گئے۔

فنڈر سے ایک اور مناظرہ

پادری فنڈر کو مولانا رحمت اللہ ہندوستان سے بھگا چکے تھے۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں وہ قسطنطنیہ پہنچا تو مولانا کو سلطان کے حکم سے مناظرے کے لیے بلایا گیا۔ فنڈر نے وہاں بھی شکست فاش کھائی۔ مولانا قسطنطنیہ سے مکہ معظمہ واپس آگئے تو مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کر دی جو خدا کے فضل سے اب تک کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ سلطان نے ان کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر مولانا نے اپنے حقیقی بھتیجے مولانا بدر الاسلام کو اپنے پاس بلا لیا اور تعلیم و تربیت دے کر سلطان کے خاص ملازموں میں شامل کرا دیا۔

مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ وہیں ۲۲۔ رمضان ۱۳۰۸ھ (۱-۲۔ مئی ۱۸۹۱ء)

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ (انگریزی) صفحہ ۲۷۰۔

کو وصال ہوا اور مدینہ منورہ کی خاک پاک کے دامن میں آسودگی پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر وزیر خاں نے علاج معالجہ شروع کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بدوی سردار کی اہلیہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا تھی۔ ہر معالج سے مایوس ہو کر وہ ڈاکٹر وزیر خاں کے پاس پہنچا۔ ان کے علاج سے خدا نے شفا بخشی تو سردار نے کہا جو خدمت فرمائیں انجام دوں، ڈاکٹر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور کہا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

کچھ مدت کے بعد حکومتِ برطانیہ نے حکومتِ ترکیہ سے گفت و شنید کر کے ڈاکٹر صاحب کی حوالگی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ جب بدوی سردار کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے شریف مکہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ڈاکٹر وزیر خاں میری امان میں ہیں، جب تک میرے قبیلے کے بیس ہزار کٹ نہ جائیں گے، کوئی شخص ڈاکٹر صاحب پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ چنانچہ حکومت ترکیہ نے پروانہ اجازت منسوخ کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب پندرہ سال زندہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ یا ۱۸۷۳ء میں بہ مقام مدینہ منورہ وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

بزرگان دیوبند

پہلا درجہ

بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم۔ ان کے اسماءِ گرامی اس سرزمین کے آسمان پر اُن درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم وہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے جو دلوں اور روحوں میں برابر دینِ حق کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار ـــــــ دارالعلوم دیوبند ـــــــ ایسی ہے جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام وبقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سیکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دوائر میں قابلِ فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی، وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا، اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے

مولانا عاشق الٰہی کا بیان

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اس میں سے قاضی سعادت علی خاں پسرِ قاضی نجابت علی خاں کے دو فرزند تھے، ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا، چھوٹا بھائی اطمینان سے امیرانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں میں باہمی حد محبت تھی گویا ایک دوسرے کے جان نثار اور عاشق زار تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں ایک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خاں چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارن پور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ ایک بنیے کو بیچارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی۔ اس نے سپینکی[۱] صاحب کے پاس رپورٹ کر دی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے اور کئی روز سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خونِ ناحق

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ذکی الحس انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی خاص ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے[۲]۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

قاضی عنایت علی خاں

قاضی عنایت علی خاں ان حالات سے بالکل بے خبر گھر میں بیٹھا تھا۔ حق ناشناس اور بے گناہ کُش انگریزوں نے اُسے اطلاع تک نہ دی ورنہ وہ بھائی کو موت کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے تگ و دو ہی کر لیتا۔ اسے جب اس واقعۂ الیمہ کا علم ہوا تو دنیا نظروں میں تیرہ و تار ہو گئی۔ بھائی کے جوشِ انتقام میں فوراً آدمی فراہم کیے۔ جب معلوم ہوا کہ چند سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی بہنگیاں رکھے ہوئے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے ہیں تو قاضی عنایت علی خاں اپنے جانبازوں کو لے کر شیر علی کے باغ کے پاس گھات میں جا بیٹھا، اچانک سواروں پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا اور اُنھیں زخمی کر کے بھگا دیا۔

سامان ہاتھ آیا تو جمعیت فراہم کی اور شاملی پر ہلّہ بول دیا۔ وہاں خزانہ لوٹا اور بڑی تباہی پھیلائی۔ مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ:

> حاکم شاملی پہنچا اور چاروں طرف لاشوں اور سب کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصّے سے تھرا اُٹھا۔ آخر یہ کہہ کر کہ "تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔" مظفرنگر

---

[۱] SPANKIE صحیح نام ہے، یہ ضلع سہارن پور کا سول افسر تھا، مولانا عاشق الٰہی نے اسے "پنکی" لکھا ہے۔ [۲] تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۴۔

واپس چلا گیا۔

نظم ونسق

جب تسخیر دہلی کی افواہ پھیلی تو قاضی صاحب کو حفاظت کا خیال آیا۔ یہاں تک کہ تھانہ میں خبر گرم ہوئی، انگریزی فوج پہنچ رہی ہے، قاضی صاحب تھانہ بھون سے رخصت ہو کر نجیب آباد کی طرف چلے گئے وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے، کچھ پتا نہ چلا۔ گویا ایک بھائی کو انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا، دوسرے نے اس کے انتقام کی پریشانی میں گھربار اور زندگی تباہ کر لی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں، دُنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چنانچہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ چونکہ حکومت کے فیصلوں اور شرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی، اس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔[1]

ایک واقعہ

مولانا عاشق الٰہی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب، مولانا رشید احمد، مولانا محمد قاسم اور حافظ ضامن کا مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

> یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے، وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے، گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[2]

مبادا "سرکار کے مخالف باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو، یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحبؒ ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے۔ لیکن "سرکار" کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ اول ص۷۴۔ [2] ایضاً ص۷۵۔

بظاہر اس سے حکومت مراد لی جائے۔ کتاب "تذکرۃ الرشید" جس زمانے میں اور جن حالات میں مرتب ہوئی تھی، انگریزوں کا اقتدار اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی؟

حافظ محمد ضامن

حافظ محمد ضامن جو میرے اندازے کے مطابق انگریزی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ تھانہ بھون کے باشندے اور حضرت حاجی صاحب کے خواجہ تاش یا پیر بھائی تھے، یعنی دونوں حضرت میاں جی نور محمدؒ جھنجھانوی کے مرید تھے۔ حافظ صاحب کے کمالات کا اندازہ بعض روایات سے ہو سکتا ہے، مثلاً:

١- جب کوئی شخص ان کے پاس آتا تو فرماتے، بھائی اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو (مولوی شیخ محمدؒ کی طرف اشارہ کر کے کہتے) مولوی صاحب سے پوچھ لے، اگر تجھے مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب، ان سے مرید ہو جا۔ اگر حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔[1]

٢- اپنے مرشد طریقت حضرت میاں جیؒ صاحب کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے، حافظ صاحب کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ ڈالیں۔ حافظ صاحب نے فرمایا: رشتے کی پروا نہیں، لیکن میں جس طرح جھنجھانہ جاتا ہوں، اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں، اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔[2]

میلی سن کا پیش کردہ نقشہ

اب آپ میلی سن کا پیش کردہ نقشہ سامنے رکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شاملی کے ایک ہندو زمیندار مہار سنگھ نے ہنگامہ برپا کیا تھا اور دربار دہلی سے تعلقات مکاتبت پیدا کر لیے تھے۔ انگریز اسے دبا نہ سکتے تھے البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ پھر سپنکی صاحب نے گورکھوں کا ایک جیش بھیج دیا، اور ایڈورڈز نے اس کمک سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنے ایک وفادار مسلمان ماتحت ابراہیم خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ شاملی میں چھوڑا اور ایڈورڈز خود بڑھانا چلا گیا۔ یہ ۵ ستمبر کا واقعہ ہے۔

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ١٥٦ - [2] ایضاً ایضاً۔

اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر قاضی عنایت علی خاں نے اپنے جانباز جوان ساتھ لیے اور شاملی پر حملہ بول دیا۔ ابراہیم خاں نے مقابلہ کیا، لیکن آخر وُہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔ میلی سن لکھتا ہے کہ ابراہیم خاں کے ساتھ عہد ہوا تھا، کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی عزت و جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، لیکن حوالگی کے بعد ایک سو تیرہ آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا[1]۔

بعد کے حالات

ایڈورڈز لوٹا تو اُسے بڑا غصہ آیا، لیکن مظفر نگر سے تشویشناک خبریں ملیں تو اُدھر چلا گیا۔ بعد ازاں ایک جیش تھانہ بھون بھیجا گیا جو سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھا۔ کپتان سمتھ اور لفٹنٹ کیولر اس کے کماندار تھے۔ چونکہ اس جیش کی تعداد کم تھی، اس لیے مجاہدین نے اُسے مار بھگایا۔ آخر مزید چند روز گزر گئے تو ڈنلاپ آیا۔ تھانہ بھون پر قبضے کے بعد وہ شاملی پہنچا اور وہاں بھی انگریزی حکومت بحال کر دی۔

میرا اندازہ ہے کہ حافظ محمد ضامن کپتان سمتھ اور لفٹنٹ کیولر کے مقابلے میں شہید ہوئے۔ جس افسر کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے شاملی کی ویرانی دیکھ کر غصہ آیا، وہ ایڈورڈز تھا۔ ڈنلاپ کے حملے کے بعد سب کو منتشر ہونا پڑا۔

حاجی صاحب اور مولانا قاسم

انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد حضرت حاجی صاحب نے چند مہینے انبالہ، نگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضعات و قصبات میں چھپ چھپا کر گزارے پھر سندھ اور کراچی کے راستے عرب تشریف لے گئے۔ روانگی سے پیشتر گنگوہ بھی پہنچے تھے تاکہ مولانا رشید احمد سے ملاقات کر لیں اور وہاں راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل میں قیام کیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد باقی عمر مبارک وہیں گزار دی۔ مولانا محمد قاسم کے بھی وارنٹ جاری ہوئے تھے، وُہ کچھ مدت گرفتار نہ ہوئے، پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مولانا رشید احمد

مولانا رشید احمد تھوڑی دیر چھپے رہے۔ گنگوہ میں پولیس پہنچی تو مولانا کے چچیرے بھائی مولوی ابوالنصر کو گرفتار کر لیا اور یہ سمجھ کر بہت تکلیفیں دیں کہ یہی مولانا رشید احمد ہیں، جب غلط فہمی آشکارا ہوئی تو ایک اور مخبر کی اطلاع پر پولیس رام پور گئی اور وہاں سے مولانا کو گرفتار کر کے سہارن پور لے گئی۔ یہ ۱۲۷۵ھ کے اواخر یا ۱۲۷۶ھ کے اوائل کا واقعہ ہے یعنی وسط ۱۸۵۹ء کا۔ مولانا کی اہلیہ نے یہ زمانہ بے مثال صبر سے گزارا۔ اُن کے والد مولوی محمد تقی، کچھ ہی دن پیشتر نواب جھجر کی ملازمت میں شہید ہو چکے تھے۔ پھر یکایک یہ مصیبت نازل ہو گئی۔

مقدمہ

مولانا نے تین چار دن کال کوٹھڑی میں گزارے اور پندرہ دن حوالات میں رہے۔ مقدمہ پیش ہوا تو حکم ہو گیا کہ

---

[1] جلد ششم ص ۱۲۴ ۔ [2]

انھیں مظفرنگر لے جانا چاہیے ۔ تقریباً چھ ماہ بعد انھیں رہائی ملی ۔

میلی سن لکھتا ہے کہ تھانہ بھون کے واقعہ کے بعد جو گرفتاریاں ہوئیں ان کے متعلق سپینکی نے حکم دے دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انھیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکاب جرم قطعی طور پر ثابت ہو جائے ۔ مولانا کے خلاف ایسے اثبات کا کوئی بھی امکان نہ تھا ، لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے ۔

"تذکرۃ الرشید" میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے ، جنھوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی ، غلام علی ساکن قصبہ ملی پور اور حکیم احمد امیر بخش رام پوری ۔

نواب علی بہادر اور نواب تفضل حسین

باندہ

باندہ صوبہ غرب وشمال کے الہ آباد ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل اور آبادی ۱۸۵۶ء میں چھ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کی شمالی اور شمالی و مشرقی سرحد دریاے جمنا پر واقع تھی، مغرب میں ضلع ہمیرپور اور جنوب اور جنوب و مشرق میں پنا، چرکھاری اور ریوا کی ریاستیں تھیں۔ باندہ، کیروی اور راجاپور اس ضلع کے بڑے بڑے قصبے تھے۔ سرزمینِ پاک و ہند کے چند مشہور قلعوں میں ایک کالنجر بھی تھا جس کے لیے زبردست لڑائیاں ہوتی رہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے یہاں جنگ کی تھی، شیر شاہ سوری نے بھی یہ قلعہ فتح کر لیا تھا لیکن اس کے سامنے وہ گولوں میں آگ لگ جانے کے باعث جل جانے کے باعث فوت ہوا۔ کالنجر باندہ ہی میں تھا۔

نوابانِ باندہ

چھترسال بندھیلہ کے خاندان کی ایک لڑکی کسی لڑائی میں محمد خاں بنگش کے ہاتھ قید ہوئی۔ باجی راؤ پیشوا کے قیدی چھڑا دیے تو چھترسال نے لڑکی کو واپس لینے میں پس و پیش کی، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی قید میں رہ چکی تھی نیز وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ باجی راؤ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا اور اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام شمشیر بہادر تھا۔ باجی راؤ کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اسے پیشوا کے خاندان کا فرد قرار دینے سے انکار کر دیا، البتہ بندھیل کھنڈ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ شمشیر بہادر نے کھلم کھلا اسلام کا اعلان کر دیا۔ پانی پت کی لڑائی میں وہ مرہٹوں کی طرف سے لڑا تھا، سخت زخمی ہوا اور بھرت پور پہنچ کر وفات پائی۔

اس کے بیٹے علی بہادر اول نے سندھیا کی امداد سے بندھیل کھنڈ کے کئی علاقے فتح کیے، ماہی مراتب کا اعزاز حاصل کیا، دہلی میں وفات پائی اور قطب صاحب میں اسے دفن کیا گیا۔ علی بہادر کے فرزند ذوالفقار بہادر نے ۱۸۱۲ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے نواب کا خطاب اور باندہ کی جاگیر حاصل کی۔ یہ ذوالفقار بہادر مرزا غالب کی ممانی کی ہمشیر کے بطن سے تھا۔ چنانچہ میرزا انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور

اور مسند نشین حال (علی بہادر) کا چچا تھا اور وہ میراہم شیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی (والدہ غالب) کا دودھ پیا تھا۔[1]

نواب بہادر علی ثانی

نواب علی بہادر ثانی اسی ذوالفقار بہادر کا صاحبزادہ تھا۔ ۱۲۶۵ھ (۱۹۴۵ء) میں مسند نشین ہوا۔ منیرؔ شکوہ آبادی نے جلوس کی تاریخ کہی :

علی بہادرِ عالم پناہِ بندہ نواز — نہاد چوں بہ سرِ خویش افسرِ شوکت
منیرؔ مصرعِ تاریخِ ایں عمل گفتہ — جلوس باد مبارک بمسندِ نصرت

۱۲۶۵ھ

جلوس کے بعد گورنر کی طرف سے خلعت آیا تو منیرؔ فرماتے ہیں :

کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ
آج آیا ہے خلعتِ اقبال

۱۲۶۵ھ

یہی علی بہادر تھے جن کے لیے میرزا غالبؔ نے ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا :

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۱۸۵۷ء

باندہ میں اس وقت ہنگامہ بپا ہوا جب فتح پور سے مجاہدینِ آزادی وہاں پہنچے ۔ یہ ۸۔ جون ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، لیکن جلد ہی ہنگامہ فرو کر دیا گیا ۔

جو سپاہی باندہ میں مقیم تھے، وہ کان پور کی رجمنٹوں سے متعلق تھے ۔ وہاں ہنگامہ بپا ہونے کی خبریں ۱۴۔ جون کو باندہ پہنچیں تو سراسیمگی پیدا ہوئی ۔ نواب کی امداد سے ان سپاہیوں کو ہتھیار رکھ دینے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیاب نہ ہو سکی ۔ البتہ نواب نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریز عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں اور انھیں اپنے محل میں محفوظ رکھا ۔

سپاہیوں نے بنگلوں کو لوٹا، خزانے پر قبضہ کیا، سازوسامانِ جنگ ساتھ لیا اور کان پور روانہ ہو گئے ۔ نواب نے نظمِ حکومت

---

[1] "خطوطِ غالب" مرتبہ مصنف صفحہ ۳۵۰ ۔

قائم کرنے کی انتہائی کوششیں کیں لیکن معاملات قابو سے باہر نکل چکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جگہ جگہ دو عملی کی صورت قائم کر رکھی تھی۔ کچھ اختیارات خود سنبھال رکھے تھے کچھ مقامی رؤسا کو دے دیے تھے۔ اس دو عملی کے اثرات کو افراتفری میں دور کرنا آسان نہ تھا۔

نواب کی کوششیں

مارچ ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج باندہ پہنچی تو نواب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ کالپی چلا جائے، جہاں راؤ صاحب، رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپے موجود تھے۔ چنانچہ اس نے کالپی کی جنگ میں حصہ لیا۔ وہاں شکست کھائی تو اپنے رفیقوں کے ساتھ گوالیار کا رُخ کر لیا۔ فارسٹ نے لکھا ہے کہ گوالیار سے پندرہ میل کے فاصلے پر اُنھوں نے آیندہ طرزِ عمل کے متعلق مشورہ کیا۔ رانی کی تجویز تھی کہ جھانسی کے قلعہ کرّاڑا میں چلنا چاہیے، تانتیا ٹوپے کی رائے تھی کہ ہمارے لیے بندھیل کھنڈ بہتر ہے۔ خود راؤ صاحب نے کہا کہ بندھیل کھنڈ میں نہ ہمیں ضرورت کے مطابق سامان رسد مل سکے گا اور نہ بندھیلے ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں گے، بہتر یہ ہے کہ دکن چلیں، جہاں سب لوگ ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔ تاہم اس سے پیشتر ہمیں گوالیار چلنا چاہیے۔ وہاں کی فوج کو ساتھ لے کر سیپری کے راستے آگے بڑھنا مناسب ہوگا۔ سندھیا اور رانی بیضا بائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے اور تمام مالکانِ ریاست انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔[۱]

آخری دَور

بہ ہر حال نواب علی بہادر گوالیار کی جنگ میں موجود تھا۔ پھر تانتیا ٹوپے کے ساتھ وسط ہند میں چلا گیا۔ ملکہ وکٹوریا کا اعلانِ عفوِ عام ہوا تو نواب علی بہادر نے نومبر ۱۸۵۸ء میں اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اس امر سے بحث نہیں کہ نواب کے دلی افکار و خیالات کیا تھے: تاہم اس نے نہ محض کسی انگریز کو قتل نہ کیا تھا بلکہ ایک ایک کی جان بچائی تھی۔ میلی سن لکھتا ہے کہ نواب نے ۱۴ جون کے ہنگامے میں افسروں کی جانیں بچائیں۔ ہمیر پور اور فتح پور سے جو انگریز بچ کر آئے تھے، اُنھیں بھی اپنی حفاظت میں لے لیا:

> اس کی مہمانداری اور حفاظت حتی الامکان ہر اُس یورپی پناہ گیر کے لیے وقف رہی،
> جو اس کے پاس پہنچتا رہا۔ جب فوج کی سرکشی نے اس کے لیے مزید حفاظت کی گنجایش

۱؎ فارسٹ جلد سوم ص ۲۵۶ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ میلی سن نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے، گوالیار پر قبضے کی تجویز رانی نے پیش کی تھی اور یہی بہترین تجویز تھی۔

نہ چھوڑی تو اس نے مہمانوں کو اس علاقے میں صحیح سلامت پہنچا دیا، جو اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔[1]

اس حد درجہ شریفانہ اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل کے باوجود نواب سے ریاست چھین لی گئی اور اُسے اندور میں نظر بند کر دیا گیا۔ صرف تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ ۱۸۷۲ء میں اُسے بمبئی بلایا گیا اور دربار میں جگہ دی گئی۔

وفات

۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں بمقام اندور ہی اس نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ مُنیرؔ نے تاریخِ وفات کہی جو نواب کی سیرت کا بھی ایک جامع مرقع ہے:

نواب علی بہادر، اے بحرِ کرم — یوسف طلعت شجاعِ یکتا، ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ مُنیرؔ — اے اہلِ سخن کے عزت افزا، ہے ہے
اے صدر نشینِ خُلق و اقبال و شکوہ — اے بزمِ کرم کے مسند آرا، ہے ہے
اُٹھ جائے جواں جو تو زمانے سے ہائے — صد حیف، افسوس، وا دریغا، ہے ہے

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے مُنیرؔ
فیاضِ زماں، امیرِ زیبا ہے ہے[2]

۱۲۹۰ھ

فیاضی و دوست نوازی

یقیناً علی بہادر بڑا ہی فیاض اور دوست نواز تھا۔ اندور میں اگرچہ صرف تین سو روپے وظیفہ ملتا تھا لیکن دوستوں کو تحائف بھیجتا رہتا تھا۔ مثلاً ۱۸۶۶ء میں بیگم نے جس کا لقب افتخار محل تھا، زمرد کی انگوٹھی مُنیرؔ کو بھیجی اور خود نواب نے سفید دوشالہ ارسال کیا۔ اس نے دونوں کی تاریخ الگ کہی:

نواب افتخار محل کے حضور سے — تحریرِ التفات و عنایات آئی آج
بھیجی انگوٹھی ڈاک میں اندور سے یہاں — صد شکر شانِ لطف کریمی دکھائی آج

تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی مُنیرؔ
انگشترِ زمرد پاکیزہ آئی آج!

۱۲۸۳

---

[1] میلی سن جلد سوم ص۱۳۱۔ [2] کلیاتِ مُنیر ص۵۲۵۔

دوشالہ کی تاریخ یہ ہے:

بھیجا علی بہادر مسکین نواز نے — اندور سے جو میرے لیے تحفۂ شریف!
ممکن نہیں کہ شکرِ عنایات کر سکوں — جز و ضعیف میں ہوں یہ شئے نادر و ظریف
تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی منیرؔ
باریک ہے سفید دوشالہ بہت لطیف[1]

۱۲۸۲ھ

فرخ آباد صوبہ غرب و شمال کے آگرہ ڈویژن کے ایک ضلعے کا نام ہے، صدر مقام کا نام بھی یہی ہے۔ یہ دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ چند میل پر فتح گڑھ میں انگریزی فوج رہتی تھی۔

فرخ آباد کی ریاست محمد خاں بنگش نے فرخ سیر کے عہد میں قائم کی تھی، جس کا خطاب غضنفر جنگ تھا۔ اس خاندان کے رئیسوں میں سے نواب تجمل حسین کا نام اس وجہ سے زیادہ مشہور ہے کہ میرزا غالبؔ نے ایک غزل کے آخر میں اس کی مدح کے اشعار شامل کر دیے تھے:

دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

نصیر الدولہ، معین الملک اور ظفر جنگ اس کے خطابات تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۴۶ء کو وفات پائی۔

تفضل حسین خاں نواب تفضل حسین خاں، نواب تجمل حسین خاں کا بھتیجا اور نصرت جنگ کا بیٹا تھا۔ چونکہ تجمل حسین خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، اس لیے تفضل حسین خاں کو ریاست کا والی تسلیم کیا گیا۔ ۹۔ دسمبر ۱۸۴۶ء کو مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیرالدین فرماتے تھے، تفضل حسین خاں اتنا شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھا کہ کشمیر کے تاجر سب سے پہلے اسی کے پاس جاتے، پھر لکھنؤ کا رخ کرتے۔ یہ نواب تھا جس کے لیے ۱۸۵۷ء میں جہادِ آزادی کو تقویت پہنچانے کا کام مقدر ہو چکا تھا۔

۱۸۵۷ء ۱۰ رجمنٹ نے فتح گڑھ میں سرکشی اختیار کی اور نواب کو اپنا رئیس بنا لیا، آغا حسین سیتاپور سے دو ہزار فوج

---

[1] کلیات منیر ص ۵۰

لے آیا۔ احمد یار خاں اور محسن علی خاں مجاہدین فرخ آباد کے رئیس تھے۔ میلی سن نے دسمبر ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی کا ذکر کیا ہے جس میں فرخ آباد کے پشتینی کمانڈار "حکیم" صاحب کا ذکر بہ طور خاص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حکیم" پٹیالی میں شہید ہوا۔ اس کے ہاتھی، نقرئی ہودے اور تلوار پر قبضہ کر لیا گیا[1]۔ اگست ۱۸۵۸ء میں نواب کے پاس کم و بیش تیس ہزار کا لشکر فراہم ہو گیا تھا[2]۔

مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ غداروں نے ہر جگہ دھوکے دیے اور پانسا اُلٹ پڑا[3]۔ نواب نے انجام کار اپنے آپ کو جاں بخشی کے وعدے پر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

میلی سن کہتا ہے:

> حکومت اپنے ایک افسر کے حتمی وعدے سے پھر نہ سکتی تھی۔ اگرچہ نواب کو زندگی کی مہلت مل گئی لیکن وہ اپنے تمام منصوبوں کی کامل تباہی دیکھنے کے لیے زندہ رہا[4]۔

وہ منصوبے کیا تھے؟ انگریزوں کا اخراج، انگریزوں کا اخراج ۱۸۵۷ء میں بے شک نہ ہوا لیکن نواب کی عظمت سعی و کوشش میں تھی نہ کہ منصوبے کی تکمیل میں اور میلی سن زندہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ انگریز نہ صرف ہندوستان سے نکلے بلکہ جس عظمت پر وہ فخر کر رہے تھے اسے ہر جگہ رُسوا ہونا پڑا۔

فارسٹ کا بیان ہے کہ کالن کیمبل نے اودھ کی مہم ختم کی تو حضرت محل اور نانا نیپال چلے گئے۔ جن لوگوں نے جاں بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو حوالے کیا، ان میں سے ایک مہدی حسین تھا اور دوسرا تفضل حسین خاں والی فرخ آباد۔ یہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے[5]۔

نواب سے کہا گیا کہ جہاں جانا چاہو، بھیج دیا جائے گا۔ اس نے مکّہ معظّمہ کو منتخب کیا۔ چنانچہ اُسے جہاز پر سوار کرا کے عدن پہنچا دیا گیا۔

جلاوطنی کی زندگی

مولانا ابو الکلام کے والد ماجد مکّہ معظّمہ پہنچے تو دیکھا، جس نواب کی خوش پوشاکی کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس کا یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا کچیلا انگرکھا جسم پر تھا یہ دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص ۲۰۵۔ [2] ایضاً جلد سوم ص ۲۴۷۔ [3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۸۹۔ [4] جلد سوم ص ۲۲۲۔
[5] فارسٹ جلد سوم ص ۵۳۸۔

میں نے ہر چند کوشش کی کہ نواب کی ضروریات کا انتظام کر دوں، مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا۔ وہ کہتے تھے۔ میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں۔ میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے، نہ کہ لینے کی۔

مولانا کے والد نے نواب کی ملاقات شریف مکہ سے بھی کرا دی۔ بے نوائی کی حالت میں بھی اس نے گوارا نہ کیا کہ تحفے کے بغیر ملے۔ ایک قیمتی تسبیح اس کے پاس رہ گئی تھی، وہی بطور تحفے کے پیش کر دی۔

پھر شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی۔ معمول یہ تھا کہ وہ ظہر کے اوّل وقت حرم شریف میں آتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا۔[1]

۱۸۸۱ء میں وفات پائی اور مکہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خوابِ ابدی ہے۔

نواب سخاوت حسین

معاملہ نواب تفضل حسین پر ختم نہ ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو بھی ۱۸۵۷ء ہی کے واقعات کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی۔ مُنیرؔ شکوہ آبادی نے اس حادثۂ الیمہ کی تاریخ کہی:

ریاضِ خُلق، سخاوت حسین خاں نواب   نہالِ باغِ کرم، زیبِ مسندِ شوکت
جوانِ قابل و فرزندِ خاصِ نصرت جنگ   غلامِ آلِ نبیؐ، سرورِ قمر طلعت
سخاوت اور مروت میں بے نظیرِ جہاں   ریاست اور امارت کے واسطے زینت
ہر ایک دِل میں جگہ اس کی جان سے بڑھ کر   ہر اِک زبان پر اس کا وظیفۂ مدحت
زمانہ اس کی مروت پر اس طرح شیدا   مشامِ روح ہو جس طرح عاشقِ نکہت
وہ بے گناہ ہُوا تیغِ مرگ سے مقتول   عنایت اس کو کیا حق نے گلشنِ جنت
مُنیرؔ نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ۔
ہُوا شہید امیرِ دلیر باہمت[2]

۱۲۷۳ھ

دو اور مظلوم

فرخ آباد کے دو اور رئیسوں کو بھی اسی سلسلے میں انگریزوں کے حکم سے پھانسی دی گئی۔ نواب

---

[1] مصنف کی کتاب "غالب" کے مختلف مطالب کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی تصریحات۔ [2] کلیاتِ مُنیر ص ۴۹۱۔

اقبال مند خاں بہادر اور نواب غضنفر حسین خاں بہادر - اُن کا علم بھی مُنیرؔ کے قطعہ تاریخ سے ہُوا۔ فرماتے ہیں:

اقبال مند خان و غضنفر حسین خاں — دونوں درِ محیط عطا آہ آہ ہائے
دونوں جوان نیک، امیرانِ باحشم — مقتول تیغ تیز قضا آہ آہ ہائے

تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے مُنیرؔ
دونوں شہید راہِ خُدا آہ آہ ہائے[۱]

---

۱ کلیات مُنیر ص ۳۹۱ -

خان بہادر خاںؒ

ابتدائی حالات

خان بہادر خاں ابن ذوالفقار خاں (ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں) کی تاریخ پیدائش ۱۲۰۵ھ بتائی جاتی ہے یعنی ۹۱-۱۷۹۰ء۔ اگرچہ خاندانی ریاست مٹ چکی تھی، تاہم امیری کے آثار باقی تھے انھیں کی آغوش میں تربیت ہوئی، وقت کے رواج کے مطابق تعلیم پائی اور بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور رہے، ملازمت مدت پوری کرکے پنشن لی۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر تقریباً ستر سال کی ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء

میرٹھ میں سپاہ کی سرکشی کا حال معلوم ہوتے ہی مختلف مقامات پر ہنگامے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں چنانچہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی سے سلسلہ شروع ہوا، پھر شاہ جہان پور، بدایوں اور مراد آباد میں بھی انگریزی اقتدار ختم ہو گیا۔ خان بہادر خاں اس خاندان میں سے تھے، جو پہلے روہیل کھنڈ کا مالک رہ چکا تھا۔ اپنی عمر اور ناموری کے لحاظ سے بہت معزز سمجھے جاتے تھے اور چونکہ ساری زندگی سرکاری ملازمت میں گزاری تھی اس لیے نظم و نسق کا تجربہ بھی انھیں خاصا تھا۔ انھیں اوصاف کی بنا پر ان کی حکمرانی کا اعلان ہو گیا۔ انگریز سب کچھ چھوڑ کر نینی تال چلے گئے۔

دوسری روایت

مفتی انتظام اللہ خاں فرماتے ہیں کہ بریلی کے کمشنر الیگزانڈر صاحب نے خود خان بہادر خاں کو بُلا کر کہا تھا کہ آپ انتظام سنبھال لیں، ہم آپ کو مسند نشین کرتے ہیں۔ خان بہادر نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ میں ضعیف العمر ہوں اور اس بار کو سنبھال نہیں سکتا۔

جب کمشنر نینی تال چلا گیا اور ضلع بے سردار رہ گیا تو جنرل بخت خاں نیز فوجی افسروں اور عمائد شہر نے متفق ہو کر خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کا نواب منتخب کیا۔ بہادر شاہ نے انتظام الدولہ حافظ الملک خان بہادر خاں ہزبر جنگ کے خطابات عطا کیے۔[1]

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۶-۱۳۸ سید الطاف علی صاحب نے ہزبر جنگ کی جگہ خونریز جنگ لکھا ہے۔

نظم و نسق جنرل بخت خاں دہلی چلے گئے، اس لیے کہ مرکز کو تقویت پہنچانی لازم تھی اور یقیناً وہاں قابل و کارداں سپہ سالار کی اشد ضرورت تھی۔ خان بہادر خاں کے نظم و نسق کی کیفیت یہ بتائی گئی:

نام	عہدہ
سوبھارام	دیوان ریاست
نیاز محمد خاں	جنرل
مدار علی خاں	سپہ سالار
مولوی خاں	افسر کمپو
عبدالرحمٰن خاں رام پوری	"
منشی فرحت اللہ	بخشی فوج
اکبر علی خاں	کوتوال شہر
نظام علی خاں	نظامت شاہجہاں پور
رفیع علی شاہ	نظامت بدایوں[1]

عام کیفیت خان بہادر خاں نے شہروں اور اضلاع کا انتظام درست کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن انگریزوں کا بیان یہی ہے کہ علاقے کی تمام بستیوں نے خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم نہ کی اور فرقہ وار کشمکش بھی شروع ہو گئی، اس لیے کہ مسلمان ہندوؤں پر سختیاں کرتے تھے اور ہندوؤں کی آرزو یہ تھی کہ جلد سے جلد انگریز واپس آجائیں۔

خدا جانے یہ بیانات کن اطلاعات پر مبنی ہیں۔ جس شخص نے دیوانی کا عہدہ ایک ہندو کارکن کے حوالے کر دیا تھا اس پر فرقہ وار کشمکش پیدا کرنے کا الزام لگانا سراسر ناقابل فہم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ انگریزوں سے متعلق تھے اور ان کے کارندوں کی حیثیت میں کام کر رہے تھے، ان پر یقیناً سختیاں ہوتی تھیں، خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، لیکن مذہبی اختلاف کی بناء پر سختیوں کا بیان سراسر افسانہ بافی کا کرشمہ ہے۔

جنگ بریلی خان بہادر خاں نے تقریباً ایک سال حکومت کی۔ مئی ۱۸۵۸ء میں کالن کیمبل شاہ جہاں پور کو فتح کرتا ہوا

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۷ - ۱۳۸۔

بریلی آیا۔ مرادآباد کی طرف سے بریگیڈیر جونز فوج لے کر آ رہا تھا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ خان بہادر خاں نے بچ نکلنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن حافظ رحمت خاں کے اخلاف کی رگوں میں جو گرم روہیلہ خون موجزن تھا، وہ کبھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ دشمن سے مقابلہ کیے بغیر کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ چنانچہ خان بہادر خاں نے ۴ مئی کو اپنی فوج جنگ کے لیے آراستہ کی۔ اس نے نکٹیا ندی سے گزر کر ایک اُونچے مقام پر توپیں نصب کیں اور پیادہ فوج کے دونوں بازوؤں پر رسالے کے پرے جمائے۔ ۵ مئی کو بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ کالن کیمبل کے پاس رسالہ زیادہ تھا، اس لیے وہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔

غازیوں کی ترکتاز

خان بہادر خاں کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اُٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، تلوار نہ چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے۔ عین اس موقع پر اس جیش نے حملہ کیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ بڑے وجیہ تھے، جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا، ڈاڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے، سبز رنگ پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمربند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات نقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملہ کے لیے آئے۔ سر نیچے کر رکھے تھے اور اُنھیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا۔ تلواریں بلند تھیں۔ "دین" "دین" پکار رہے تھے[1] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ سکھ اس سیل کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی گھاگرا پلٹن پر جا گرے۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدانِ جنگ ہی میں جانیں دے دیں۔ تین غازی بریگیڈیر کیمرون[2] پر جا گرے اور اُسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح بریگیڈیر وال پول کی جان بڑی مشکل سے بچی[3]۔

ایک اور چال

اب بظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا لیکن یکایک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ غازیوں کی ترکتاز سے فائدہ اٹھا کر خان بہادر خاں کے رسالے نے انگریزی فوج کے میسرے کا چکر کاٹا اور وہ فوج کے عقب میں پہنچ گیا تاکہ انگریزوں کا کیمپ اور سازوسامان لوٹ لے۔ اس سے کیمپ میں شدید خوف وہراس پیدا ہو گیا اور ہر شخص سراسیمہ وار اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس اثنا میں غازیوں کے

---

[1] انگریز مورخوں کے بار بار "دین دین" کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ عموماً تکبیر کہتے تھے، بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰؓ کی دلاوری کے جوشِ اتباع میں "یا علی" بھی پکارتے تھے۔ [2] CAMERON

[3] میلی سن جلد چہارم ص ۳۶۸-۳۶۹

ایک اور مختصر جیش نے حملہ کر دیا اور وہ سب بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

غرض اس جوانمردانہ مقابلے نے کالن کیمبل کو رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ادھر تاریکی کا دور دورہ شروع ہوا ادھر خان بہادر خاں بریلی سے نکل کر پیلی بھیت چلا گیا جو تینتیس میل شمال مشرق میں تھا۔

پوائیں میں ظہور

مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجا پوائیں کو غداری اور بدعہدی کی عبرت ناک سزا دیں۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں، نواب تفضل حسین خاں، ولایت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا[1]

گرفتاری

۱۸۵۹ء میں کوہستان نیپال کے دامن کی ایک لڑائی میں خان بہادر خاں گھوڑے سے اتفاقیہ گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ انگریز اُسے لکھنؤ لائے چیف کمشنر کے روبرو پیش ہوا تو زمین پر بیٹھ گیا کرسی پیش کی گئی تو فرمایا: مدتوں کرسی پر بیٹھے اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے چیف کمشنر نے اُسے بزور کرسی پر بٹھایا۔

بیان

جب پرسش شروع ہوئی تو بڑی مردانگی سے فرمایا:

میں نے از خود بغاوت پر کمر نہیں باندھی۔ سرکار انگریزی کی فوج باغی ہو گئی اور جس ملک کا جو دعوے دار تھا، اس کا رئیس گردانا۔ بریلی، شاہجہاں پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی کل روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے بلوا نہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا، تب میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے اختیار میں نہ تھی۔ انھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعد ازاں لڑائیاں جا بجا سر میدان میری اور آپ کی فوج کی البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا، اس میں میری کیا خطا:

---

[1] سیلی سن جلد پنجم صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲

عروس ملک کسے در کنار گیرو تنگ
کہ بوسہ برلب شمشیرِ آبدار زند !

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہیے میری نسبت حکم دیجیے۔[1]

تبصرہ خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا، اس کے جواب میں اس نے جو کلمات عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا تھا وہ یقینی اور قطعی طور پر درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا، نہ کسی انگریز افسر کو بطور خود سزائے موت دی۔ سپاہ تمام امور میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی لیکن انگریزوں کے قتل کے متعلق کسی کا حکم شاذ ہی مانا گیا، کیوں؟ اس لیے کہ اوّل سپاہ کو انگریزوں کے غلط اور جابرانہ طرزِ عمل کے باعث سخت غصہ تھا، دوم انگریز جہاں جہاں کامیاب ہوتے رہے، اس ملک کے باشندوں پر نہایت خوفناک اور ہول انگیز ظلم کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اہلِ ملک کے سینے انتقام کے جذبات سے بے طرح بھر جاتے اور انھیں انگریزوں کے خلاف کسی بھی کارروائی سے روکنا ممکن نہ رہتا۔ یہی ہوا لیکن جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اسے افعالِ قتل کے لیے معذرت نہ سمجھا جائے۔ غلط فعل بہر حال غلط ہوتا ہے خواہ اسباب کچھ ہوں تاہم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ جن حالات میں واقعات قتل پیش آئے وہ سراسر غیر معمولی تھے اور اس ضمن میں غیر معمولی اشتعال خود انگریزوں نے پیدا کر دیا تھا۔

پھانسی خان بہادر خاں کے لیے پھانسی کی سزا غالباً پہلے سے تجویز ہو چکی تھی۔ پھر انگریزوں کی شقاوت اور سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ یہ سزا لکھنؤ میں نہ دی بلکہ خان بہادر خاں کو بریلی لے گئے اور وہاں کوتوالی کے سامنے پھانسی پر لٹکایا۔

آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کر دیجیے۔ فرمایا: مجھے کچھ نہیں کہنا۔ پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا:

بجرمِ کلمۂ حق مے کشند غوغا ئیست
ز مرگِ زندگیم مے شود تماشائیست

چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا شورش ہو جائے، اس لیے انگریزی فوج اور توپ خانے سے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

---

[1] تاریخ سلیمانی بحوالہ حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۶۳ - ۲۶۴۔

پھانسی کے بعد نعش اس وجہ سے متعلقین کے حوالے نہ کی گئی کہ وہ لوگ باہر دفن کریں گے تو قبر زیارت گاہ عام بن جائے گی۔ ڈسٹرکٹ جیل بریلی ہی میں دفن کرا دیا۔

سید الطاف علی بریلوی کے ایک بزرگ اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے نعش کو بلا کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھا تو اپنا رومال مرحوم کے چہرۂ مبارک پر ڈال دیا۔

خان بہادر کی مُہر پر "الحکم اللہ والملک اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔[1]

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں صہ ۳۶۴۔

نواب محمود خاں

خاندان

نواب محمود خاں، عام طور پر "جنرل" محمود خاں کہے جاتے ہیں۔ نواب حسین خاں (ابن ضابطہ خاں ابن نجیب الدولہ) کے فرزند اور غلام قادر خاں روہیلہ کے بھتیجے تھے۔ نواب نجیب الدولہ کے خاندان کی بلندی اور اثر و رسوخ کی وسعت کسی تصریح کی محتاج نہیں۔ اگرچہ پہلی شان اور پہلی ریاست باقی نہ رہی تھی، تاہم محمود خاں اپنے آبائی وطن نجیب آباد میں زندگی امیرانہ طور طریق پر گزار رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا اور محمود خاں کو ضلع بجنور کا نظم و نسق سنبھال کر انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔

حالات کے ماخذ

بجنور میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو فراز و نشیب کے چند مراحل سے گزرنا پڑا۔ ان کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذریعے ہیں، اوّل وہ کتابیں جو انگریزوں نے لکھیں اور ان میں اپنے نقطۂ نگاہ سے تمام حالات بیان کیے، دوم سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور کے بیانات جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بجنور کے صدر امین تھے اور انھوں نے انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں سرگرم حصہ لیا، اس لیے کہ وہ دیانتداری سے اسی طرزِ عمل کو درست سمجھتے تھے۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ ہنگامے کا نتیجہ حسبِ مراد نہ نکلے گا اور اس سے ملکی و قومی مقاصد کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ سر سید کی رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان کے بیانات کی درستی اور صحت میں غالباً کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔

آغاز

میرٹھ[1] کے ہنگامے کی خبر ۱۳ مئی کو بجنور پہنچی تھی۔ اگرچہ دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ صرف چالیس میل تھا۔ خواجہ حالی نے غالباً سر سید کے بیان کی بناء پر فرمایا ہے کہ یہ خبر ۱۲ کو پہنچ گئی تھی۔[2] اس وقت سے حالات بگڑنے لگے۔ وہاں تھوڑے سے انگریز تھے۔ کلکٹر اور مجسٹریٹ کا نام شیکسپیر تھا، لیکن اسے تین ایسے مسلمان عہدیدار مل گئے تھے،

---

[1] میلی سن جلد ششم ص ۴۳۰ ۔ [2] حیات جاوید حصہ اول ص ۶۸

جیسے غالباً کسی بھی انگریز افسر کو نہ مل سکے ، اول محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر، دوم سرسید صدر امین ، سوم مولوی تراب علی تحصیلدار۔ ان تینوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر جس مردانگی سے انگریزوں کی حفاظت کی اور جس حسن تدبیر سے ضلع کو ہنگامے سے بچائے رکھنے کی کوششیں کیں، اس کی مثال مشکل سے ملے گی ۔

غرض یکے بعد دیگرے مختلف مقامات سے خبریں آتی رہیں کہ لوگوں نے حکومت کا جوا اتار پھینکا ہے اور جیل خانے کے دروازے کھول دیے ہیں ۔ غیر ممکن تھا کہ بجنور ان خبروں کے اثرات سے محفوظ رہتا۔ شیکسپیر کلکٹر کو خیال تھا کہ سب سے پہلے خزانے پر یورش ہوگی۔ اس نے خزانے کا روپیہ پہلے ایک کنوئیں میں ڈلوا دیا، پھر باہر سے ہاتھی منگوا کر پچاس ہزار کی رقم محفوظ مقام پر پہنچا دی۔

کہا جاتا ہے کہ نواب محمود خاں پہلے تین سو پٹھانوں کے ساتھ بجنور آیا تھا، پھر واپس چلا گیا ، ۳۱ مئی کو بریلی میں بھی آگ بھڑک اٹھی اور بجنور میں قیام امن کی طرف سے بالکل ربزہ ہوگئی ۔ اوائل جون میں محمود خاں دوبارہ آگیا ۔

نواب سے فیصلہ

اس پوری مدت میں سرسید انگریزوں کی حفاظت کرتے رہے ۔ ایک موقعہ پر شدید اندیشہ پیدا ہوگیا تو سرسید اپنے کمسن بھتیجے کو ملازم کے حوالے کر کے خود پہرے کی غرض سے کلکٹر کے بنگلے پر چلے گئے اور ملازم کو تاکید کر گئے کہ میں مارا جاؤں تو بچے کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دینا۔

جب شیکسپیر کو بجنور میں بیٹھے بیٹھے حالات کے سدھارنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی بلکہ باہر سے مخابرت کے سلسلے بھی منقطع ہوگئے تو اس نے خود نواب سے فیصلہ کر لینا مناسب سمجھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دس روز کے لیے شیکسپیر اور اس کے ساتھی باہر چلے جائیں ، نواب تمام انتظامات کا ذمہ دار رہے ، مگر اُسے مالیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہ ہو۔ چونکہ اسے انتظام کے سلسلے میں خاصا روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا ، لہٰذا خزانے میں جتنا روپیہ باقی تھا، اس کے حوالے کر دیا گیا البتہ یہ کہہ دیا گیا کہ خرچ کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جائے ۔

سرسید کی کوشش

یہ فیصلہ یقیناً سرسید کی کوششوں سے ہوا۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے نواب محمود خاں سے گفتگو کی اور کہا :

> چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بہتر ہے کہ ان کو صحیح وسالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ۔ . . . . . . اس معاملے کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کر لیا[1]۔

---

[1] حیات جاوید حصہ اوّل ص ۷۱

خواجہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سرسید نے کلکٹر کی طرف سے جو تحریر نواب محمود خاں کو دی تھی، اگر وہ اس کے مطابق عمل کرتا تو اُسے کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔[1] یہ وہی تحریر تھی جس کے مضمون کا خلاصہ ہم اُوپر درج کر چکے ہیں۔ غرض شیکسپیر اور دوسرے انگریز ۸۔ جون کو بجنور سے روانہ ہو گئے اور ۱۱۔ کو بہ خیر و عافیت رڑکی پہنچ گئے۔

سرسید اور میر تراب علی بھی باہر نکل گئے۔ محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر پہلے ہی باہر تھے۔ محمود خاں نے انتظام سنبھالا تو سرسید، میر تراب علی اور رحمت خاں تینوں کو بلا لیا اور کہا کہ وہ معمول کے مطابق کام کریں۔ نواب کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے کارکنوں کی حیثیت میں نہیں، بلکہ نواب کے کارکنوں کی حیثیت میں رہیں۔ سرسید نے یہ شرط پیش کی کہ آپ انگریز کلکٹر سے منظوری منگوا لیں تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب کے کارندوں نے سرسید اور میر تراب علی کے مکان چھین لیے اور ان کا سامان بھی لے لیا۔

نااتفاقی کے بعد اتفاق

ضلعے کا انتظام خود کلکٹر نے نواب کے حوالے کیا تھا، اب بہترین صورت یہی تھی کہ اس انتظام کی درستی اور اچھائی پر خاص توجہ مبذول کی جاتی اور رعایا کے لیے امن و راحت اور خوشحالی و فارغ البالی کے اسباب فراہم کیے جاتے، لیکن افسوس کہ بعض افراد کی نالائقی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ ہندو چودھری ایک فریق بن گئے یعنی بجنور اور ہلدور کے چودھری، نواب کے آدمی دوسرا فریق بن گئے۔ "حیاتِ جاوید" سے معلوم ہوتا ہے ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے نواب محمود خاں کی فوج پر حملہ کر دیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔[2] میلی سن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ ۶ اگست کو ہوا تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چودھریوں کے ساتھ جو انبوہ تھا، اس نے بے قابو ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ مسلمانوں نے یہ حالت دیکھی تو نگینہ کو لوٹا، ہلدور میں چودھریوں کو شکست دی اور بجنور پر قبضہ کر لیا اور بعض چودھریوں کو بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ آخر فیصلہ ہو گیا کہ نواب کو حکومت کا مختار تسلیم کیا جائے اور بارہ ہزار روپے ماہانہ کی رقم اسے دی جائے۔ نواب کا خلف اکبر، نیز اس کا بھانجا اور ماڑے خاں خاص کارندے قرار پائے۔ اس کے بعد نواب نے حدود ضلع سے باہر بھی حملے کیے۔[3]

انگریزوں کا اقدام

وسط فروری ۱۸۵۸ء کے بعد انگریزوں نے بجنور میں فوجی اقدام کی تیاری شروع کی۔ اپریل میں وہ بڑھے۔ اب ایک نئی مصیبت برپا ہوئی۔ جو ہندو چودھری مسلمانوں کے مقابلے میں شکست

---

[1] حیات جاوید حصہ اول ۸۱۔

کھاکر بھاگے وہ انگریزوں کے ساتھ ہو گئے اور سرگرم کوششیں شروع کردیں کہ جو مسلمان ان کے خلاف لڑائیوں میں شریک رہے تھے، ان سب کو انگریزوں کے روبرو باغی ثابت کریں اور انھیں سزائیں دلائیں اور خود انگریزوں کے وفادار وخیر خواہ قرار پائیں۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اگر اس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔[1]

سرسید کی راستبازی

سرسید ہنگامے کے حق میں نہ تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہندو رئیس ذاتی اغراض کے ماتحت مسلمانوں کو خواہ مخواہ ہدف مصائب بنانے کے لیے کوشاں ہیں، تو انھوں نے بے باکانہ کلکٹر اور افسران فوج سے گفتگو کی اور واضح کردیا :

> سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے لیے، قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ تجویز ہو سو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے پر شہری فوج اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔[2]

انگریزوں سے مقابلہ

آخر اسی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا لیکن جو لوگ یقین کیے بیٹھے تھے کہ انھیں انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے اسی میں ملک کی بہتری ہے اور یہی شریعت کا تقاضا ہے، وہ چپ چاپ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں نے آم سوت، نجیب آباد اور نگینے میں انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ہزاروں ان لڑائیوں میں جاں بحق ہوئے۔[3]

مفتی انتظام اللہ لکھتے ہیں کہ احمد اللہ خاں نے جہاد کا علم بلند کیا تھا، شفیق اللہ خاں بھی احمد اللہ خاں کا ہم نوا بن گیا تھا، اور اس نے چار ہزار سپاہ فراہم کر لی تھی۔[4]

فوج کا چشم دید حال

سید ظہیر دہلوی نے بھی "داستان غدر" میں نواب محمود خاں کا سرسری ذکر کیا ہے۔ جس سے فوج کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سید موصوف جب پانی پت سے نکل کر لکھنو جا رہے تھے تو لکھتے ہیں کہ گنگا کو عبور کر کے فیروز آباد پہنچے اور نمبر دار کے ہاں ٹھہرے تو :

---

[1] حیات جاوید حصہ اول ص۸۴۔ [2] ایضاً ایضاً۔ [3] ایضاً ایضاً۔ [4] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۱۳۲۔

نجیب آباد والے نواب کا آدمی آیا کہ رات کون آدمی گنگا اتر کر تمھارے ہاں آئے ہیں، کوئی انگریزی مُخبر تو نہیں ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہم آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم میں سے ایک آدمی ہمارے ساتھ چلو، غرضیکہ میں ہی اس کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی دور فوج پڑی ہوئی تھی، ڈیرے خیمے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی مجھے ایک ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں چند لوگ عزت دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اُنھوں نے مجھ سے حال پوچھا، میں نے مختصر بیان کیا کہ تباہی زدہ دِلّی کا رہنے والا ہوں، انگریزوں کے خوف سے ہم لوگ جان بچاتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی بولا کہ تم لوگ نوکری کر لو، یہاں ٹھہر جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ ہم نوکری کے لائق نہیں، ہم لوگ لکھنؤ کو جائیں گے[1]۔

یعنی فوج بے سروسامان بھی نہ تھی اور ہر لحظہ چوکس بھی رہتی تھی۔ چوکی پہرے کا خوب انتظام تھا اور ہر آیند و روند کے متعلق آگاہی حاصل کی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدمی ملازم رکھنے کا بھی خاص اہتمام تھا۔

آخری دور

غرض نواب نے معاملات کو سنبھالے رکھنے میں کوئی دقیقہ سعی اُٹھا نہ رکھا۔ دہلی سے بھی تعلق پیدا کر لیا تھا، کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے امیر الدولہ، ضیاء الملک محمود خاں بہادر مظفر جنگ کا خطاب دیا تھا، منشی جیون لال نے ۸ر جولائی کے حالات میں لکھا ہے کہ نواب محمود خاں رئیس نجیب آباد نے بجنور، دھام پور، نگینہ اور آدم پور پر قبضہ کر لیا[2]۔

انگریز بجنور پر قابض ہو گئے تو نواب کے خلاف مقدمہ چلا اور حبس دوام بر عبور دریائے شور کی سزا ملی، لیکن ابھی انڈیمان بھیجے نہ گئے تھے کہ قید ہی میں وفات پائی۔

---

[1] داستانِ غدر صفحہ ۱۳۶۔ [2] دو روزنامچے (انگریزی) صفحہ ۱۴۴۔

کنور سنگھ اور امر سنگھ

انگریزوں کی بدسلوکی

کنور سنگھ جگدیش پور ضلع شاہ آباد (بہار) ایک راجپوت رئیس تھا، جس کا خاندان زمانۂ قدیم سے ریاست کا مالک چلا آتا تھا۔ انگریزی حکومت میں نظام مالیہ کی پیچیدگیوں کے باعث اس کے خلاف مقدمے ہوئے اور اعلان کر دیا گیا کہ اس کی جاگیر نیلام ہو جائے گی، اس غریب نے جائداد بچانے کی غرض سے عہد کیا کہ قرضے ادا کرنے کے سلسلے میں بیس لاکھ روپیہ فراہم کروں گا۔ روپیہ فراہم ہو رہا تھا اور قرضے ادا ہونے کی صورت پیدا ہو رہی تھی، اچانک حکم جاری ہو گیا کہ ایک مہینے کے اندر اندر پورا روپیہ ادا کرو تو ٹھیک ہے، ورنہ جائداد کی نیلامی نہ رکے گی۔ پٹنہ کے کمشنر نے اس حکم سے اختلاف کیا، حقیقت بالادست افسروں پر واضح کی کہ ایسے قدیم رئیس کو یوں برباد نہ کرنا چاہیے لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۶ء میں صرف اس کا ایک مقدمہ باقی رہ گیا تھا، اگر اس کا بھی فیصلہ کنور سنگھ کی اُمید کے مطابق ہو جاتا تو غالباً وہ سنبھلا رہتا لیکن ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ بھی خلاف ہوا تو کنور سنگھ نے، جس کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی، انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کا پختہ فیصلہ کر لیا پھر دم واپسیں تک اس نے اپنی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں۔

آرہ پر حملہ

دانا پور کی سپاہ سرکشی اختیار کر چکی تھی اور سامان جنگ کے ساتھ دریائے سون کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ اس کے لیے دریا سے پار اترنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ عین اس موقع پر کنور سنگھ نے اپنے کاشتکاروں کو اٹھا دیا۔ کشتیوں کا انتظام کیا۔ ۲۶۔ جولائی کو سپاہی دریا کے پار اُترے اور کنور سنگھ نے ساتھ ہو کر آرہ پر ہلّہ بول دیا۔ یہ لوگ بڑی مردانگی سے لڑے، انگریزوں کو بار بار شکستیں دیں لیکن ۳۔ اگست کو مزید انگریزی فوج آگئی لہٰذا کنور سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو مجبوراً جگدیش پور کی طرف ہٹنا پڑا۔

مزید لڑائیاں

پھر انگریزوں سے جگہ جگہ مڈبھیڑ ہوئی۔ آخر کنور سنگھ اپنے ساتھیوں کو لے کر ضلع شاہ آباد سے نکلا جس کا مرکزی مقام آرہ تھا اور ضلع مرزا پور میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی خوب ہنگامہ بپا رکھا۔ مختلف مقامات

پر افراتفری پڑی رہی۔ جب انگریزی تعداد میں تعاقب کے لیے پہنچ گئے تو کنور سنگھ مرزا پور سے نکل کر ضلع الہ آباد میں داخل ہو گیا۔ اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی منزل مقصود اودھ ہے، جہاں انگریزوں کے خلاف سرگرمی سے لڑائیاں جاری تھیں اور جگہ جگہ مجاہدین کی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔

انگریزوں میں سراسیمگی

اچانک کنور سنگھ کو خیال آیا کہ انگریزی فوجیں ہر طرف سے لکھنؤ پر بڑھ رہی ہیں اودھ کے مشرق میں جتنے انگریزی علاقے واقع ہیں، وہ تقریباً خالی ہو چکے ہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اترولیہ پہنچا جو ضلع اعظم گڑھ کی سرحد سے قریب تھا۔ وہاں اسے کچھ اور سپاہی مل گئے۔ ۲۰۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو اس نے اعظم گڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ راستے میں انگریزی فوج سے ٹکر ہوئی اور انگریز سالار کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ پیچھے ہٹے۔ اسی طرح کنور سنگھ اسے دباتا ہوا اعظم گڑھ تک لے گیا۔ انگریز سالار نے ہر طرف کمک کے لیے پیغام بھیج دیے۔

ہومز لکھتا ہے کہ جب کنور سنگھ کے مقابلے میں انگریزوں کی شکست کی خبر الہ آباد پہنچی تو گورنر جنرل وہاں آیا ہوا تھا۔ چنانچہ سراسیمگی پیدا ہو گئی، اس لیے کہ خطرہ تھا کنور سنگھ بنارس پر حملہ کر کے کلکتہ اور لکھنؤ کے درمیان حمل ونقل کے سلسلے منقطع کر دے گا۔ فوراً ایک فوج الہ آباد سے اس کے مقابلے پر بھیجی گئی۔ ۶۔ اپریل کو اعظم گڑھ کے سامنے سخت لڑائی ہوئی۔ ساتھ ہی مزید انگریزی فوجیں آ گئیں اور کنور سنگھ اعظم گڑھ سے چلا تو دریائے گنگا کو عبور کر کے دوبارہ اپنے وطن جگدیش پور کے جنگلوں میں جا بیٹھا۔ وہاں اس کا بھائی امر سنگھ بھی بہت سے کسانوں کو ہمراہ لے کر پہنچ گیا تھا۔

عبور گنگا

اس سلسلے میں دریائے گنگا سے پار اُترنے کا واقعہ ایک رومان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہیے۔

اعظم گڑھ سے جگدیش پور پہنچنا سہل نہ تھا۔ کنور سنگھ نے اپنی فوج کو اس طرح تقسیم کیا کہ منزل مقصود کی طرف پیش قدمی بھی جاری رہے اور انگریزوں کو یہ احساس بھی ہوتا رہے کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار نہیں بلکہ مقابلہ جاری رکھے گا۔ اس طرح وہ ضلع غازی پور سے گزرا۔ اب اس کے پاس آدمی بہت زیادہ نہ رہے تھے۔ لہٰذا اس نے دشمن کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے عجیب وغریب تدبیریں اختیار کیں۔ عام افواہ پھیلا دی کہ کشتیاں نہیں ملتیں لہٰذا دریا ہاتھیوں کے ذریعے پار کیا جائے گا اور گھاٹ کا پتا بھی بتا دیا۔ تعاقب کرنے والے انگریز افسر نے اپنی فوج اسی گھاٹ کے آس پاس گھات میں بٹھا دی۔ کنور سنگھ نے اس مقام سے سات میل نیچے گنگا کو عبور کیا۔ انگریز افسر کو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو تیزی سے اس گھاٹ پر پہنچا جہاں سے کنور سنگھ گزر رہا تھا اور ایک کشتی بھی پکڑ لی تھی جس میں فوج کا آخری دستہ جا رہا تھا۔

کلائی گنگا کی نذر

خود کنور سنگھ نے ابھی دریا عبور نہ کیا تھا۔ اب وہ روانہ ہوا تو گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ دریا کے عین بیچ میں ایک گولی اس کی کلائی پر لگی۔ زخم اتنا سخت و شدید تھا کہ کلائی کاٹے بغیر بچاؤ کی صورت کوئی نہ تھی۔ بہادر کنور سنگھ، جس کی عمر اسّی سال کی ہو چکی تھی، دوسرے کنارے پر پہنچا اور اُسے یقین ہو گیا کہ کلائی بہرحال کاٹنی پڑے گی تو اس نے اپنی تلوار میان سے کھینچی اور زخمی کلائی والا بازو ایک ہی ضرب میں کہنی سے کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر کٹا ہوا بازو دریا میں ڈالتے ہوئے گنگا سے مخاطب ہو کر کہا:

ماتا! اپنے سپوت کی اس آخری قربانی کو شرفِ قبول عطا کر۔

سادرکر نے کیا خوب لکھا ہے کہ بے شمار اور بے حد و حساب آدمی گنگا کو ماتا کہہ کر پکارتے ہیں لیکن کنور سنگھ جیسے غیر معمولی بہادر بیٹوں ہی کی بدولت گنگا کی امومت میں عظمت و شان پیدا ہوتی ہے، آسمان پر ان گنت ستارے ہیں لیکن چاند ہی کا طلوع اس کے لیے زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے[1]

لی گرانڈ کی شکست

کنور سنگھ جگدیش پور کے جنگل میں جا بیٹھا تو کپتان لی گرانڈ نے اس پر حملے کا فیصلہ کیا۔ وہ فوج کے ساتھ ۲۳ راپریل ۱۸۵۸ء کو آرہ سے نکلا۔ پہلے اس جگہ توپوں سے گولے برسائے جہاں کنور سنگھ کے متعلق خبر ملی تھی، پھر فوج کو آگے بڑھایا۔ کنور سنگھ نے جب دیکھا کہ دشمن زد میں آگیا ہے تو اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ بول دیا۔ انگریزوں نے لکھا ہے کہ اس وقت کسی نے انگریزی فوج کے لیے مراجعت کا بگل بجا دیا حالانکہ لی گرانڈ نے ایسا کوئی حکم نہ دیا تھا۔ بہرحال انگریزی فوج پیچھے کی طرف بھاگی، نظم کا شیرازہ کھل گیا۔ آرہ تک کسی کو ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا۔ اس فوج میں ایک سو ننانوے گورے تھے، صرف اسّی باقی بچے۔ زخمیوں کو ہاتھیوں پر لاد کر لائے لیکن مرہم پٹی کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے کہ کنور سنگھ نے شفا خانے پر قبضہ جما لیا تھا[2]

وفات

اس شاندار فتح سے تین روز بعد ۲۶ راپریل ۱۸۵۸ء کو کنور سنگھ نے وفات پائی۔ وفات کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے۔ قیاس یہ ہے کہ اس نے دریائے گنگا پر اپنے ہاتھ سے اپنا بازو کاٹا تھا، اس کی وجہ سے خون زیادہ بہ گیا۔ اسّی سال کی عمر ہو چکی تھی۔ نتیجہ موت کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ تاہم وہ جب تک زندہ رہا آزادی کی فضا میں سانس لیتا رہا، جب مرا تو آزاد تھا اور آزادی ہی کی حالت میں اس کی ارتھی جلائی گئی۔

شخصیت

سادرکر نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلابیوں میں اس جیسی جنگی صلاحیت کا شخص کوئی نہ تھا۔ بیلی سن

---

[1] سادرکر ص ۲۴۹-۲۵۰ - [2] ایضاً ص ۳۵۲ -

کہتا ہے کہ انقلابیوں میں سے تین آدمیوں نے جنگی صلاحیت کا ثبوت دیا، ایک مولانا احمد اللہ، دوسرا تانتیا ٹوپے اور تیسرا کنور سنگھ۔ ہمیں باہم مقابلے کی ضرورت نہیں لیکن یقیناً تانتیا ٹوپے کی حیثیت اتنی بلند نہیں جتنی مولانا احمد اللہ اور کنور سنگھ کی ہے اور عزم و شجاعت میں رانی لکشمی بائی کا مقابلہ بہ آسانی نہیں ہو سکتا۔

امر سنگھ

جانبازوں نے متوفی سردار کے بھائی امر سنگھ کو جانشین بنا لیا۔ انگریزی بیانات کے مطابق اسے مئی ۱۸۵۸ء میں کم و بیش چار مرتبہ پے در پے شکستوں سے سابقہ پڑا اور بظاہر سمجھا جانے لگا گویا کنور سنگھ اپنے ساتھ مزاحمت کی قوت و ہمت بھی لے گیا۔ لیکن امر سنگھ نے بہت جلد اپنی غیر معمولی صلاحیت کے عملی ثبوت پیش کر دیے۔ اس نے سوچا، ساری فوج کو اکٹھا رکھ کر لڑانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریز بھی اپنی قوت مجتمع کر لیں گے۔ لہٰذا اس نے تمام ساتھیوں کو چھوٹے چھوٹے جیشوں میں تقسیم کر کے ہر طرف پھیلا دیا اور ایک ایک وقت میں کئی کئی مقامات پر چھاپوں کا تار باندھ دیا۔ جگدیش پور پر بھی وہ قابض ہو گیا۔ پھر آرہ کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا بلکہ کہا جاتا ہے آرہ کی بیرونی چوکیوں پر بھی امر سنگھ نے کئی مرتبہ ترکتازیں کیں۔

آخری دور

آخر انگریزوں نے ایک خاص نقشۂ عمل بنا کر مختلف سمتوں سے فوجیں جگدیش پور پر بھیجیں تاکہ امر سنگھ کو گرفتار کر لیا جائے۔ جب اس نے دیکھا کہ نرغے کا حلقہ لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتا جا رہا ہے تو اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر نکلا اور گنے کے ایک کھیت میں چھپ گیا، اسی طرح اس کے ساتھی بھی ایک انگریز افسر کی غلطی کے باعث بچ نکلے اور کیمور کی پہاڑیوں میں پہنچ گئے جو ضلع شاہ آباد کے جنوب و مغرب میں واقع ہیں۔

امر سنگھ کے متعلق بعد کے انگریزی بیان بالکل خاموش ہیں۔ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ اسے بہار سے نکال دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ دیر تک چھاپہ مار جنگ کرتا رہا اور آخر نیپال کی طرف چلا گیا۔

نواب ممو خاں

نام اور عہدہ اصل نام علی محمد خاں تھا لیکن لوگ "ممو خاں" کہتے تھے۔ برجیس قدر مسند حکومت پر بیٹھے تو حضرت محل نے اُنھیں دولہ کا خطاب بھی دیا تھا لیکن یہ آخری وقت تک "ممو خاں" ہی کے عرف سے مشہور رہے۔

حضرت محل کی ڈیوڑھی میں داروغہ تھے۔ گویا ان کا سارا کاروبار انھیں کے ذریعے سے انجام پاتا تھا۔ مزاج کے تیز تھے اور خود رائی بھی ان میں بہت زیادہ تھی۔ چونکہ حضرت محل کے کاموں کو ہمیشہ بڑے اہتمام، خلوص اور وفاداری سے انجام دیتے رہے اس لیے خاص معتمد علیہ تھے۔

برجیس قدر کی مسند نشینی برجیس قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں اُن کی کوششوں کو خاص دخل تھا۔ فوج نے پہلے اور شہزادوں کو تجویز کیا جب ان میں سے کوئی بھی تیار نہ ہُوا تو ممو خاں اور شیخ احمد حسین نے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ سے برجیس قدر کا ذکر کیا۔ راجا نے کہا کہ تمام بیگمات اتفاق رائے سے فیصلہ کر لیں تو فوج برجیس قدر کو بھی منظور کرے گی۔ بیگمات متفق نہ ہو سکیں۔ پھر ممو خاں نے راجا سے مل کر یہ صورت پیدا کی کہ فوج کے افسر برجیس قدر کو دیکھ کر اور بات چیت کر کے خود فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ اس طرح خاص شرطوں کے ماتحت فیصلہ ہُوا جس کی تفصیل حضرت محل کے حالات میں پیش کی جا چکی ہے۔

فیصلے میں شام ہو گئی تھی غروب آفتاب میں صرف چند منٹ باقی تھے اس وقت جلوس کے لیے ساعت نیک کا سوال پیدا ہُوا۔ ایک رئیس نے کہا کہ آج شب دو شنبہ اور قمر در عقرب ہے، بہتر ہے کہ نیک ساعت کا انتظار کیا جائے۔ ممو خاں نے کہا کہ تم ہر امر میں حجت کی ایک شق نکالتے ہو۔ چنانچہ ساعت کے سعید و غیر سعید ہونے کا سوال خارج از بحث قرار دے کر

ا؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۲۰-۲۲۶

اسی وقت رسم جلوس ادا کی گئی۔

دورِ جنگ آزادی اس وقت سے ممو خاں کو داروغہ دیوان خاص بنایا گیا۔ گویا تمام معاملات کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، اگرچہ فیصلے حضرت محل کے حکم سے ہوتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ممو خاں نے کئی کمیدانوں کو موقوف کر کے ان کی جگہ اپنے متوسلین رکھے۔ روپے کے لیے بڑی تنگ ودو کی؛ امرا اور دوسرے اصحاب سے بھی سختی کے ساتھ خاصی بڑی رقمیں وصول کیں۔ جب اس بارے میں سختیاں بہت بڑھ گئیں تو مولانا احمد اللہ شاہ نے اس طرزِ عمل کو غیر مناسب قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ ممو خاں جہاں اپنے آدمی تحصیل زر کے لیے بھیجیں گے، ہم اطلاع ملتے ہی انھیں گرفتار کر لیں گے۔ اس بنا پر ممو خاں نے خود مولانا احمد اللہ شاہ سے بھی لڑائی چھیڑ دی اور مصالحِ عمومی کا کچھ خیال نہ کیا۔

لکھنؤ سے جانے کے بعد انگریز لکھنؤ پر قابض ہوئے تو حضرت محل کے ساتھ ممو خاں بھی نکلے۔ خاصی دیر تک اودھ کے شمالی حصے میں جنگ جاری رکھی۔ جولائی یا اگست میں یہ کیفیت تھی کہ حضرت محل اور ان کے ساتھیوں کے پاس ساٹھ ستر ہزار سے کم فوج نہ ہوگی۔ فوج کا بڑا حصہ حضرت محل اور ممو خاں کے ساتھ چوکا گھاٹ میں تھا جو دریائے گھاگھرا کے کنارے فیض آباد سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ باقی فوج رام بخش، بھوناتھ سنگھ، چندا بخش، گلاب سنگھ، نرپت سنگھ، بھوپال سنگھ اور شہزادہ فیروز شاہ کی سرکردگی میں تھی[1]۔

ستمبر تک صورتِ حال یہ تھی کہ اودھ کے وسطی حصے میں مشرق سے مغرب تک ایک تنگ خطہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے شمال میں حضرت محل، ممو خاں، نرپت سنگھ اور فیروز شاہ آمادۂ جنگ تھے۔ اس کے جنوب میں بینی مادھو، ہنمنت سنگھ، ہری چند اور دوسرے مجاہد سرگرمِ پیکار تھے۔ ان میں سے ہری چند نے سندیلہ پر بھی حملہ کیا تھا[2]۔

نیپال کا رُخ جب کوئی اُمید باقی نہ رہی تو حضرت محل نیپال چلی گئی۔ برجیس قدر بھی ساتھ تھا۔ وہاں جانا نیپال کے فوجی افسروں کی اجازت پر موقوف تھا۔ ممو خاں نے ان افسروں سے بہت نامناسب گفتگو کی تھی، اس لیے وہ ممو خاں کو اجازتِ داخلہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ سید کمال الدین حیدر فرماتے ہیں:

> یہ (ممو خاں) فوج جنگی کے ساتھ رہے۔ جب فوج شکست کھا کر گھبرا کر پہاڑ پر چڑھنے لگی تو سو گھوڑے سواروں کے گر کر مر گئے، سیکڑوں اُونٹ مع بارِ عظیم گر کر مر گئے۔

---

[1] میلسن جلد پنجم صفحہ ۱۸۹۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۹۔

گرفتاری

یہ نیپالی افسروں سے نامناسب گفتگو کر ہی چکے تھے، لہٰذا کھلم کھلا نیپال جانے کی اُمید نہ تھی۔ مجبوراً حضرت محل کی قیام گاہ کے قریب ٹھہرے رہے۔ موقع پایا تو ملازموں کے بھیس میں قیام گاہ پر پہنچ گئے رانا جنگ بہادر حضرت محل کی ملاقات کے لیے آیا تو اس نے بے حد صاف صاف کہہ دیا کہ آپ بہ آرام و راحت جہاں چاہیں رہیں لیکن باقی لوگوں کو، جن پر بغاوت کا الزام ہے، ہم نہ رہنے دیں گے، اس لیے کہ انگریزوں سے ہمارا عہدنامہ ہے اور ہم انگریزوں کے دشمنوں کو اپنا دشمن اور انگریزوں کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ گویا ممو خاں کے لیے نیپال میں قیام کی کوئی صورت نہ رہی۔

تاہم یہ پھر چپ چاپ اُٹھے اور حضرت محل کی قیام گاہ سے قریب ایک گھاٹی میں جا ٹھہرے۔ پھر رانا جنگ بہادر کے بھائی نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ خود جنگ بہادر آیا تو ممو خاں سے پوچھا کہ آیا کسی میم یا صاحب کو اپنے ہاتھ سے بھی مارا ہے؟ ممو خاں نے نفی میں جواب دیا۔ جنگ بہادر نے کہا کہ پھر مطمئن رہیے۔ اس اثنا میں ایک انگریز افسر آ گیا اور جنگ بہادر کی اجازت سے ممو خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ لے آیا۔

بتاریخ ۱۴ر جمادی الاولی ۱۲۷۶ھ بروز دوشنبہ (۱۲ر دسمبر ۱۸۵۹ء) وہ جیل خانے میں داخل ہوئے۔ شیخ سکھن رسالدار بھی ساتھ ہی گرفتار ہوا تھا[1]۔ گویا ممو خاں نے حضرت محل کے داخلۂ نیپال کے بعد تقریباً ایک سال نیپال یا اس کے حوالی میں گزارا۔

مقدمہ اور سزا

مقدمہ پیش ہوا تو ممو خاں نے بڑے اچھے جوابات دیے۔ بہت سی چٹھیاں بھی دکھائیں، جن سے واضح ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے بدخواہ نہ تھے۔ پھر انھیں جیل خانے سے نکال کر فرح بخش کے ایک کمرے میں رکھا گیا، خرچ کے لیے کچھ یومیہ مقرر ہو گیا اور خدمت گار بھی ساتھ رہنے لگے۔ کئی مہینے کی پیشیوں کے بعد پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ جارج کیمبل کے پاس اپیل ہوئی تو اس نے موت کی سزا کو انڈیمان میں قید کی سزا سے تبدیل کر دیا، چنانچہ وہ انڈیمان بھیجے گئے۔ راستے میں جہاز سے اُتر کر بھاگے اور پکڑے گئے۔ اس وجہ سے ان کی سزا حبس دوام کی شکل اختیار کر گئی[2]۔

آخری دور

مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶۵ء میں انڈیمان پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں کرنیل فورڈ انڈیمان کا سپرنٹنڈنٹ تھا:

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۶۷۔ [2] ایضاً ص ۳۶۸۔

پچاس نفر قیدیان بغاوت واسطے مدد راجا بروکس صاحب کے ۱۲ ؍ جنوری ۱۸۶۶ء کو جزیرہ سراوک بھیجے گئے کہ ان میں نواب ممو خاں نائب بیگم صاحبہ والدۂ برجیس قدر بھی تھے۔ کہ سراوک میں جاکر فوت ہو گئے[1]

گویا نواب ممو خاں کی حیات اسیری کے تقریباً پانچ سال انڈیمان میں بسر ہوئے، پھر وہ سراوک چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

---

[1] تاریخ عجیب ص ۴۳-۴۴۔

مولانا پیر علی اور سیّد اکبر زماں

پیر علی خاں لکھنوی

اصل وطن لکھنؤ تھا۔ غالباً کسی خفیہ جماعت کی طرف سے قومی تنظیمات کے سلسلے میں پٹنہ بھیجے گئے تھے۔ وہاں کتابوں کی دکان قائم کر لی تاکہ بے مشغلہ پٹنہ میں اقامت تجسس پیشہ لوگوں کے لیے سوءِ ظن یا توجہ کا مرکز نہ بن جائے اور اس طرح بھید نہ کھل جائے۔ ان کا اصل کام یہی تھا کہ انگریزوں کے خلاف اچھے سرگرم کارکن پیدا کریں اور ان کے ذریعے سے قومی تحریک کو جا بجا پھیلا دیں۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، زیادہ دولت مند بھی نہ تھے اور مخلص کارکن زیادہ تر اسی حلقے میں سے اٹھتے ہیں، جس کے مالی وسائل چنداں قابلِ ذکر نہیں ہوتے، اس لیے کہ درد و احساس کی طبعی دولت ایسے ہی قلوب میں محفوظ رہتی ہے، جن کی جیبیں زیادہ بھاری اور سامانِ راحت زیادہ وقیع نہ ہو۔

۳۔ جولائی ۱۸۵۷ء

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ پیر علی خاں نے کب سے پٹنہ میں کام شروع کیا اور اسے کس حد تک پورا کر سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا، جس نے تنظیم و تیاری کے لیے کوئی موقع باقی نہ چھوڑا۔ انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ ۳۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو پیر علی خاں نے کوئی دو سو دیندار مسلمان جمع کیے اور خود سبز جھنڈا لے کر ان کے آگے چلا۔ ڈھول یا نقارہ بجا کر اعلان کر رہا تھا کہ مسلمانو اٹھو اور میرا ساتھ دو۔ کیتھولک گرجے کا رُخ تھا جو شہر کے عین اندر واقع تھا۔ کمشنر نے یہ خبر سُنی تو ایک انگریز کپتان کو ڈیڑھ سو سکھوں کے ہمراہ پیر علی خاں اور اس کے رفیقوں کی روک تھام کے لیے بھیج دیا اور خود انگریزوں کی حفاظت میں سرگرم عمل ہو گیا۔

ڈاکٹر لائل

اس اثنا میں افیون کے ایک انگریز ایجنٹ ڈاکٹر لائل کو خیال آیا کہ لوگ یونہی تماشے کی غرض سے جمع ہو گئے ہیں۔ وہ کسی انگریز کی صورت دیکھیں گے تو فوراً منتشر ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور مجمع کے قریب پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجمع کی طرف سے گولیوں کی باڑ آئی۔ ایک گولی سے ڈاکٹر لائل کا کام تمام ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نعش اس طرح بگاڑ دی گئی کہ کوئی

پہچان نہ سکتا تھا۔

سکھوں کی آمد

بعد میں جو کچھ پیش آیا، وہ میلی سن کی زبان سے سُنیئے۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ انگریز ۱۸۵۷ء میں بھی تفرقہ پردازی اور اختلاف انگیزی پر کس اہتمام سے کاربند تھے۔ انگریز مکپتان سکھوں کو لے کر موقع پر پہنچا:

> مقابل فریقوں (مسلمانوں اور سکھوں) کے درمیان نہ محض کوئی ہمدردی ہی نہ تھی بلکہ نسل اور مذہب کی منافرت حائل تھی۔ ایک طرف عصبیت کی وہ روح تھی جو ابھی ابھی بیدار ہوئی تھی، دوسری طرف بہت سی پوشیدہ بے حرمتیوں کا بدلہ لینے کا موقع آیا تھا جس کی آرزو مدت سے کی جارہی تھی۔ جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق سوچ لینا بس کرتا ہے۔ صلح کی بات چیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مقابل فریق آناً فاناً بھڑ گئے۔ چند ہی لمحوں میں سکھوں کی منظم قوت اور بندوقوں نے اس سرکشی کو فرو کر دیا، جو مدت سے پٹنہ کے لیے باعثِ خطرہ بنی ہوئی تھی[1]۔

گرفتاریاں اور سزائیں

چوتھی اور پانچویں جولائی کو تلاشیاں شروع ہوئیں: تاکہ ہنگامے کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے جائیں۔ اکتیس آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں پیر علی خاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ شیخ گھسیٹا گرفتار ہوا جو پٹنہ شہر کے سب سے بڑے سیٹھ لطف علی خاں کا ملازم تھا۔ اکتیس آدمیوں میں سے چودہ مجرم قرار پائے اور انھیں بے تامل موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں وارث علی بھی تھا جو پولیس میں عہدیدار تھا اور اسے ترہٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ وارث علی کو پھانسی دینے کے لیے لے جارہے تھے تو اُس نے پکار کر کہا کہ اگر کوئی شخص شاہِ دہلی کی دوستی کا دم بھرنے والا موجود ہو تو سامنے آئے اور مجھے چھڑائے[2]۔

ان تفصیلات پر تبصرہ غیر ضروری ہے۔ جب سراسیمگی پیدا ہوتی ہے تو سیکڑوں آدمی کامیاب گروہ کی تائید کے لیے سلسلے آ جاتے ہیں اور اُلٹی سیدھی گواہیاں دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب حالات برعکس صورت اختیار کریں تو اسی بے تکلفی سے مخالف بھی بن جاتے ہیں۔

---

[1] میلی سن جلد سوم صفحہ ۳۶-۳۷۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۷۔

پیر علی اور شیخ گھسیٹا

پیر علی خاں اور شیخ گھسیٹا کو ان چودہ آدمیوں میں شامل نہ کیا گیا تھا جنھیں ۷ یا ۵ جولائی کو پھانسی دی گئی تھی، اس لیے کہ خیال تھا یہ بڑے کارکن ہیں اور ان سے دوسرے "سازشیوں" کے نام یا "سازش" کی تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ شیخ گھسیٹا کا بیان ہمارے سامنے نہیں، پیر علی خاں سے جب پوچھا گیا کہ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو اس نے بے توقف جواب دیا:

> زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان بچا لینا کارِ ثواب ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں بھی آتے ہیں جن میں جان عزیز دے ہی دینا سب سے بڑی نیکی گنی جاتی ہے۔ تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو۔ مجھ ایسے اور آدمیوں کی بھی جانیں لے سکتے ہو لیکن اس سرزمین سے ہزاروں آدمی تمھارے خلاف اٹھتے رہیں گے اور اطمینان سے حکومت کرنے کا جو مقصد تمھارے سامنے ہے، وہ کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

غور طلب نکتہ

پیر علی خاں زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اور زیادہ تجربہ کار بھی غالباً نہ ہو۔ اس کی بہادری اور اخفائے راز میں اہتمام کا معاملہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے، اس لیے کہ ان اوصاف کے لیے کتابی علم کی ضرورت نہیں، لیکن دیکھیے، اس نے کتنا اچھا اور کتنا عمدہ نکتہ بیان کر دیا، جسے باطل کی بقا و فنا کے سلسلے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پیر خاں نے کیوں کہا کہ انگریزوں کے لیے اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع قطعاً نہ آئے اور لوگ ان کے خلاف اٹھتے رہیں گے؟ اس لیے کہ وہ جانتا تھا، اجنبی حکومت کا وجود سراسر غیر طبعی ہے، اہلِ ملک اسے زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکیں گے۔ وہ برابر اٹھتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ شیش محل ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

جس حکومت کی بنیاد عوام کی رائے، مرضی اور صواب دید پختہ نہ ہو، وہ کتنی ہی تدبیریں اختیار کرتی جائے، لیکن قائم نہ رہ سکے گی اور اس کا شیرازہ ضرور درہم برہم ہو جائے گا۔ عوام میں جتنی بیداری پیدا ہوگی اتنا ہی اجنبی یا نامرغوب حکومت کے لیے خطرہ بڑھے گا۔ یہ زندگی کے بنیادی حقائق ہیں، لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھیں ان کا احساس ہو۔

پھر دیکھیے کہ زندگی کے متعلق پیر علی خاں نے سادہ لفظوں میں وہی بات کہہ دی جسے حضرت علامہ اقبال نے یوں پیش فرمایا:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

دریافت کردہ امور

مقدمے میں جو امور دریافت ہوئے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ پیر علی خاں ہی دراصل پٹنہ میں سب سے بڑا کارکن تھا۔ وہی انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ بھڑکاتا رہا:

وہ اور شیخ گھسیٹا مہینوں بے شمار آدمیوں کو تنخواہیں دیتے رہے تاکہ جب انھیں دین کے لیے اور شاہ دہلی کے لیے جنگ کی غرض سے بلایا جائے تو وہ فوراً تیار ہو کر آجائیں اس کام کے لیے بہت سے روپے کی ضرورت تھی۔ پیر علی غریب آدمی تھا۔ اس کا رفیق کار گھسیٹا دراصل بہت بڑے سیٹھ کا ہاتھ تھا۔ پس اگرچہ بہ آسانی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ سیٹھ بھی اس کام میں شریک تھا۔ لیکن فی الوقت اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی[1]

سیٹھ لطف علی خاں کے خلاف بعد میں اس بنا پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے ایک "باغی" سپاہی کو پناہ دی تھی لیکن ناکافی ثبوت کی بنا پر وہ بری ہو گیا۔

پیر علی کا اعتراف

ابھی بتایا گیا ہے کہ پیر علی خاں نے جن باتوں کا اقبال لیا، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تیاری کا پورا موقع نہ مل سکا۔ کمشنر نے جو شدید انسدادی تدبیریں اہتمام اور سختی سے اختیار کی تھیں، ان کی وجہ سے پوری تیاری کے بغیر میدانِ عمل میں آنا پڑا

---

[1] میلی سن جلد سوم صہ ۳۷

اگر کمشنر انسدادی تدبیریں شدت اور سختی سے اختیار نہ کرتا تو "سازش" آہستہ آہستہ پختہ تر اور وسیع تر ہوتی جاتی۔ اس وقت داناپور کی فوج سرکشی اختیار کرتی تو حالات یقیناً خاصے خطرناک ہوجاتے۔

سزائے موت

بالآخر پیر علی خاں اور شیخ گھسیٹا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی۔ پیر علی خاں ۳۔ جولائی کو مجروح ہوچکا تھا۔ سنگدل انگریزوں نے اس کے علاج معالجے اور مرہم پٹی کا بھی چنداں خیال نہ کیا اور بدستور بیڑیاں پہنائے رکھیں۔ سزائے موت سن لینے کے بعد اس نے انگریز حاکم سے صرف چند سوالات کیے جو مع جوابات ذیل میں درج ہیں:

پیر علی خاں: "میرے مکان کے متعلق تمھارا فیصلہ کیا ہے؟"

انگریز حاکم: "اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائیگی"۔

پیر علی خاں: "میری جائداد کے بارے میں کیا حکم جاری کررہے ہو؟"

انگریز حاکم: وہ ضبط کرلی جائے گی"۔

پیر علی خاں: میرے بال بچّوں کے بارے میں تم نے کیا تجویز کیا ہے؟

انگریز حاکم: فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا اور نہ کوئی وعدہ کیا جاسکتا ہے۔

پیر علی خاں یہ جواب سُنتے ہی کسی گھبراہٹ یا پریشانی یا جزع فزع کے بغیر پھانسی کے لیے روانہ ہوگیا۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ پیر علی خاں دینی حمیت اور انگریزوں سے نفرت میں خاص شہرت کا مالک تھا۔

سیّد اکبر زماں

سیّد اکبر زماں اکبر آبادی، بن سیّد امیر زماں، نبیرہ سید حسین زماں، فارسی اور عربی میں دستور کے مطابق تعلیم پائی۔ شعر گوئی کا بھی ذوق تھا۔ مجید تخلص کرتے تھے۔ کچھ دیر آگرہ کالج میں مدرس رہے، پھر ہیڈ مولوی ہوگئے۔ بعدازاں انھیں آگرہ کے فوجی محکمے میں میرمنشی کا عہدہ مل گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسی عہدے پر مامور تھے۔

طبیعت میں آزادی کا جوش تھا۔ ہنگامہ شروع ہوا تو جس حد تک ممکن ہوسکا، مجاہدین آزادی کی امداد کی۔ پھر اندور چلے گئے۔ آگرہ میں امن قائم ہوجانے کے بعد آئے، تو ان پر مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

انڈیمان کی زندگی

انڈیمان پہنچے تو وہاں پنڈت سالگ رام ہیڈ کلارک لگے ہوئے تھے۔ وہ

سیّد اکبر زماں کے چچا سیّد منور زماں کے دوست تھے۔ جب پنڈت جی کو سیّد اکبر زماں کے حالات معلوم ہوئے تو انھیں فوراً اپنی پیشی میں لے لیا۔ بعد ازاں سیّد صاحب اتنے با اختیار ہو گئے کہ انڈیمان میں اُن کے برابر کوئی نہ تھا۔ تنخواہ بھی خاصی ملتی تھی۔

۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں جو علمائے کرام انڈیمان بھیجے گئے تھے۔ مثلاً مولانا احمد اللہ صادق پوری، ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی، ان کے بھانجے مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ، سیّد اکبر زماں نے ان کی خدمت اور راحت رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انڈیمان کو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنا دیا۔ روپیہ بھی بہت پیدا کیا۔

مراجعت بیس سال کی قید پوری کر کے واپس ہوئے تو جو کچھ انڈیمان میں کمایا تھا، وہیں چھوڑا۔ آگرہ آکر پنشن پر زندگی گزارنے لگے۔ آخر میں وہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں انتقال ہوا۔[1]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۷۰-۷۲۔

مختلف اصحاب

نواب ولی داد خاں

یہ مالاگڑھ، ضلع بلند شہر کے رئیس تھے۔ والد کا نام بہادر خاں اور دادا کا نام حق داد خاں تھا۔ بہادر خاں نے مرہٹوں سے خوب لڑائیاں کی تھیں۔ ۱۸۱۴ء میں وفات پائی حکومت نواب ولی داد خاں کو ایک ہزار روپیہ ماہوار پنشن دیتی تھی۔ غالباً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی قریبی تعلق تھا۔ میرے اندازے کے مطابق نواب موصوف ولی داد خاں ہی کی وجہ سے ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلے سات سال کی قید ہوئی، پھر اپیل پر رہائی پائی۔

نواب ولی داد خاں کو بعض لوگوں نے بہادر شاہ کا سمدھی لکھا ہے، مجھے اس کی مفصل کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت نواب ولی داد خاں دہلی ہی میں تھے۔

نواب معین الدین حسن خاں کے روزنامچے میں مذکور ہے کہ جب منشی موہن لال عرف حسن جان پر دہلی میں آفت آئی اور مجاہدین نے اسے انگریزوں کا آدمی سمجھ کر نقصان پہنچانا چاہا تو اسے ولی داد خاں، تعلقدار مالاگڑھ ہی کی معیت میں دہلی سے باہر بھیجا گیا تھا۔ معین الدین حسن خاں نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ولی داد خاں کو شاہی خاندان سے رشتہ داری کا تعلق تھا۔[1]

تقرر اور کام

بہادر شاہ کے مقدمے میں چار مختلف مقامات پر نواب ولی داد خاں کا ذکر آیا ہے:

۱ - ولی داد خاں کو طلبی کا فرمان پہنچا تو وہ دربار میں حاضر ہوا۔ ارشاد ہوا کہ باقاعدہ حاضر رہا کرے۔[2]

---

[1] دو روزنامچے (انگریزی)، صہ ۵۸۔ [2] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی)، صہ ۱۶۲۔

۲ - دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر گوجروں نے بدامنی پھیلا رکھی تھی ولی داد خاں کو حکم ہوا کہ جائے اور بدامنی کو فرو کر دے[1]

۳ - ولی داد خاں کی عرضداشت کے جواب میں لکھا گیا کہ جس پہاڑی پر انگریز قابض ہیں، اسے مسخر کر لینے کے بعد فوجی امداد بھیجی جائے گی[2]

۴ - ولی داد خاں کے نام فرمان بھیجا گیا کہ علی گڑھ کا مالیہ وصول کرنے کے لیے حسن بخش اوزبکی اور بلند شہر کا مالیہ وصول کرنے کے لیے فیض احمد کو بھیجا جا رہا ہے ان دونوں آدمیوں کو امداد دی جائے[3]

انگریزوں کا مقابلہ

غرض جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں نواب کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ اپنے علاقے اور جمنا کے درمیان بدامنی کو ختم کر دے۔ وہ مالاگڑھ کی طرف روانہ ہوا تو غازی الدین نگر کے تحصیلدار اور تھانہ دار نے نذر پیش کی۔ نواب نے اپنے سپاہی سڑک کی نگرانی کے لیے متعین کر دیے اور مالاگڑھ پہنچنے کے بعد ضروری انتظامات میں مصروف ہو گیا۔

مین اس موقع پر سائل پور کا نمبردار پیادوں اور سواروں کے ساتھ آیا کہ بلند شہر کے کلکٹر نے میرے بیٹے چاند خاں کو کسی ثبوت کے بغیر پھانسی دے دی۔ نواب کو بڑا رنج ہوا اور اس کی دلجوئی کی۔ کلکٹر نے بے تامل نواب کو حکم بھیجا کہ اگر مفسدوں کی طرفداری کی تو تمھیں بھی پھانسی پر لٹکنا پڑے گا۔

اس نہایت غیر ذمہ دارانہ گفتگو نے نواب کو برافروختہ کر دیا۔ اس نے سرکاری ڈاک روک لی[4] اور انگریزوں سے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔

لڑائیوں کی کیفیت

لڑائیوں کی پوری کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ منشی جیون لال نے ۷۔ جولائی کے حالات میں لکھا ہے کہ نواب ولی داد خاں کی طرف سے عرضداشت آئی جس میں مذکور تھا کہ مجھ پر بلند شہر کے کلکٹر نے کئی سو گوروں کے ساتھ حملہ کیا، لیکن میں نے مین پور میں اسے شکست دی جو بلب گڑھ سے بارہ میل ہے اور تین

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۱۶۶ - [2] ایضاً ص ۱۸۲ - [3] ایضاً ص ۱۸۳ - [4] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۹۹-۱۰۰ -

توپیں چھین لیں[1]۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر بلند شہر میں بتایا گیا کہ ولی داد خاں ۲۶ مئی کو مالاگڑھ پہنچا تھا۔ بس اس وقت سے کشمکش میں لگا رہا۔ ستمبر تک جگہ جگہ لڑتا رہا، پھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بریلی چلا گیا۔ بعد ازاں معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں کہاں چھپا پھرا اور کب وفات ہوئی۔

رفیق رفیقوں اور معاونوں میں بہت سے نام بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

۱ - عبداللطیف خاں بارہ بستی جسے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔

۲ - عبداللطیف خاں کا چچا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

۳ - اسماعیل خاں جسے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۴ - مہدی بخش، اسے بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۵ - قاضی وزیر علی کی جائداد ضبط کر لی گئی، اس لیے کہ اس نے منصب قضا کا کام انجام دیا تھا۔

رفیقوں میں ایک لچھمن سنگھ کا نام بھی آیا ہے۔ غرض جائدادیں سب کی ضبط ہوئیں۔ مالاگڑھ کا قلعہ بارود سے اڑا دیا گیا اور اس سلسلے میں ایک انگریز افسر اور کچھ سپاہی بھی مارے گئے۔ ولی داد خاں کی جائداد بھی ضبط ہو گئی

مفتی عنایت احمد کاکوروی مفتی عنایت احمد، بن منشی محمد بخش، بن منشی غلام محمد، بن منشی لطف اللہ۔ ان کی ولادت بہ مقام دیوہ ۹ شوال سنہ ۱۲۲۸ھ (۵ - اکتوبر سنہ ۱۸۱۳ء) کو ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے پہلے رام پور گئے، جہاں مولوی سید محمد رام پوری اور مولوی حیدر علی سے پڑھتے رہے۔ پھر دہلی جا کر شاہ اسحاق سے حدیث کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ کر سند حاصل کی۔ بعد ازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علیؒ سے معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ ایک سال تک مولانا بزرگ علی کے مدرسے میں مدرس رہے۔ پھر منصف اور مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بہ حیثیت صدر امین بریلی میں تبادلہ ہو گیا۔ آخر ترقی کر کے آگرہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں ۱۸۵۶ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ افراتفری کے باعث آگرہ نہ جا سکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام رہا۔ بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

---

[1] دو روزنامچے (انگریزی) ص ۱۴۱

انڈیمان کی زندگی

انڈیمان میں ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، تاہم حافظے کی بناء پر علم صیغہ تواریخ حبیب الہ وغیرہ کتابیں مرتب کردیں۔ پھر ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کردیا اور یہی ترجمہ مفتی صاحب کی رہائی کا ذریعہ بنا[۱]۔

کان پور میں مدرسہ فیض عام جاری کیا۔ ۱۲۷۹ھ میں حج کے لیے گئے۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جدہ کے قریب پہنچے تو جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ دوسرے عازمین حج کے ساتھ یہ بھی سمندر میں ڈوب گئے اور درجہ شہادت پایا یہ ۱۷۔ شوال ۱۲۷۹ھ (۷۔ اپریل ۱۸۶۳ء) کا واقعہ ہے، تذکرہ مشاہیر کاکوری میں مرقوم ہے:

> یہ نہایت ہی متقی و متورع و متبحر فاضل تھے۔ علماء ربانیین میں شمار کیے جاتے تھے[۲]۔

چاند پور کے رئیس

میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے۔ انھوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی وہ عرضداشت کاغذات دفتر شاہی میں مل گئی۔ بس صرف اس بناء پر ان کا تعلقہ ضبط کر لیا گیا۔

یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر شیکسپیئر نے سرسید مرحوم کو ۱۸۵۷ء کی شاندار خدمات کے میں دینا چاہا تھا۔ سرسید نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ میرا ارادہ ہندوستان چھوڑ جانے کا ہے لہٰذا جاگیر کو کیا کروں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھانا چاہتا[۳]۔

محمد شفیع بریلوی

یاد ہوگا کہ خان بہادر خاں کو جب بریلی میں حاکم بنایا گیا تھا تو قومی قوت کو اٹھانے اور منظم طریق پر انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے جن لوگوں نے امتیازی سرگرمیاں دکھائی تھیں، ان میں بخت خاں کے علاوہ محمد شفیع بھی تھا۔ اسے رسالدار کا منصب حاصل تھا۔ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ رسالے کے افسر اعلیٰ میکنزی نے محمد شفیع کو روکنے کی ہرچند کوشش کی مگر قبول نہ کیا:

> توپ خانہ بریلی پر قبضہ کیا اور علم سبز لہرادیا۔ نواب بہادر خاں کے ساتھیوں میں ہوکر انگریز سے لڑتے رہے۔ آخری زندگی کے حالات معلوم نہ ہوسکے[۴]۔

۱۔ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۶۱۔ ۲۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۲۹۶۔ ۳۔ حیات جاوید حصہ اول ص ۹۱-۹۰۔ ۴۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۳۲-۱۳۳۔

لال بہادر خاں میواتی اصل وطن الور تھا، کچھ مدت الور میں ملازم رہا، پھر سرکار انگریزی میں بھی ملازمت کی۔ اس کے رشتہ دار فتح پور سیکری میں مقیم تھے۔ جب ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے نیمچ اور نصیر آباد کی فوجیں آگرہ پہنچیں تو لال بہادر خاں بھی ساتھ ہو گیا اور آگرہ کے قلعے تک پہنچ کر لوٹا۔ دہلی کی تسخیر کے بعد انگریزی فوج آگرہ بھیجی گئی تو میواتیوں نے فتح پور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر انگریز کامیاب ہوے اور میواتیوں کو بُری طرح تباہ کیا گیا۔ آگرہ سے دولہ شاہ تارکش نے میواتیوں کی سرکردگی قبول کر لی تھی، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے پھانسی دی لیکن لال بہادر خاں ہاتھ نہ آیا[1]

اصحاب پٹنہ پٹنہ میں افراتفری کی خبریں ملیں تو مولانا احمد اللہ شاہ، محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ایک مجسٹریٹ مولوی مہدی کو شبہات میں گرفتار کر لیا گیا وارث علی ترہٹ میں پکڑا گیا اور اس کے قبضے سے خط نکلے جنھیں باغیانہ قرار دیا گیا اور معلوم ہوا کہ پوری تحریک کی روح رواں مولوی علی کریم تھا جو پٹنہ سے قریباً نو میل کے فاصلے پر رہتا تھا اور بڑا ذی اثر مانا جاتا تھا لیکن اسے بروقت خبر مل گئی اور گرفتار نہ ہو سکا۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد مولانا احمد اللہ، مولانا محمد حسین اور مولوی واعظ الحق رہا ہوے۔ آخر الذکر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم کو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں بجرم اعانت مجاہدین ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔ وارث علی کو پٹنہ میں پھانسی دی گئی، پیر علی خاں لکھنوی، شیخ گھسیٹا اور لطف علی خاں کے حالات الگ مرقوم ہیں۔

سید کرم علی اکبرآبادی یہ ٹرانسپورٹ کے انچارج تھے۔ انھوں نے مجاہدین آزادی کی امداد میں سرگرم حصہ لیا۔ انگریزوں کا تسلط بحال ہوا تو سید صاحب کو پھانسی ہوئی۔ ان کا مزار آگرہ فورٹ کے پل پر ریل کی لائن کے پاس بنا۔ ان کا محلہ قاضی پاڑہ کھدوا دیا گیا[2]

طرہ باز خاں اور علاؤالدین یہ ان مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے حیدرآباد دکن میں عوام کو انگریزوں کے خلاف منظم کیا تھا اور ریزیڈنسی پر حملہ کرایا تھا۔ ادھر ریزیڈنسی سے توپوں کے گولے برسنے لگے، پیچھے سے سرسالار جنگ نے فوج بھیج دی۔ اس طرح انتشار میں گھر کر مجاہدین کو منتشر ہونا پڑا۔ طرہ باز خاں اور مولوی علاؤالدین گرفتار ہوے۔ اول الذکر نے بچ نکلنے کی کوشش کی اور گولی سے شہید ہوا۔ مولوی صاحب پر مقدمہ چلا

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما صد ۱۲۴۔ [2] ایضاً صد ۷۶۔

اور انھیں حبس دوام بر عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

راجا بینی مادھو بخش

یہ ان بہادروں میں سے تھا جس نے جنگ آزادی میں شرکت کی تو نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر آخری دم تک لڑتا رہا۔ بیسواڑہ کا ناظم تھا۔ سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

> اپنی بات پر مستقل ثابت قدم رہا۔ سرکار انگریزی سے کسی طرح رجوع نہ کی اور جناب عالیہ (حضرت محل) کی رفاقت سے ہاتھ نہ اٹھایا اگرچہ دامن کوہ میں رہ گیا تھا اور ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ مجبور تھا۔ آخر کئی سو آدمی ہمراہیوں سے فوج سرکار سے لڑ کر بڑی بہادری سے مارا گیا...... بعد رفع ہنگامے کے سرکار انگریزی سے اس کے متعلقین کی بسر اوقات کو کچھ علاقہ ملا، باقی قرق ہو گیا۔[1]

راجا لال سنگھ

راجا لال سنگھ نصرت جنگ، درشن سنگھ غالب جنگ کا فرزند تھا۔ بڑا قابل شخص تھا اور اکثر اس سے کلکٹری یا انتظام علاقہ جات یا انتظام شہر کی خدمات لی جاتی رہیں۔ جنگ آزادی میں وہ برابر شریک رہا۔ جب انگریز کامیاب ہوئے تو روپوش ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان عفو عام ہونے پر واپس آیا اور اپنے دیہات پر قابض ہو گیا۔ میجر بروس افسر پولیس کے سررشتہ دار دیبی پرشاد نے دشمنی کی بنا پر اسے گرفتار کرا دیا اور ایک انگریز کپتان کے قتل کا الزام اس پر عائد ہو گیا۔ کئی مہینے تک قید میں اتنی مصیبتیں جھیلیں کہ جینے سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

پھانسی کی کیفیت

دیکھنے والوں نے پھانسی دیے جانے کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء بروز شنبہ راجا کو اس مقام پر لائے جہاں انگریز کے قتل ہونے کا گمان تھا۔ دستور کے مطابق مجسٹریٹ موقع پر آیا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے:

> راجا نے اپنے ہاتھ سے گلے میں پھانسی ڈالی۔ جب تختہ کھینچ لیا، کام تمام ہو گیا۔ ڈیڑھ روپے کا کفن دے کر وہیں.... خاک میں ملا دیا۔[2]

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۷۳۔ [2] ایضاً ص ۲۶۱۔

یہ ان رؤسا سے انگریزوں کے سلوک کی حالت تھی جو پشتوں سے امتیازی درجے کے مالک چلے آتے تھے اور سیکڑوں آدمی ان کے متوسل تھے۔ "جرم" کی سزا بھی سہی لیکن یہ سلوک کہ بہت بڑے امیر اور جاگیردار کے لیے اس کے دھرم کے مطابق آخری مراسم کا انتظام کرنے میں بھی بخل سے کام لیا گیا؟

جنرل نیاز محمد خاں یہ بھی بڑے مجاہدوں میں سے تھا۔ خوب لڑتا رہا۔ آخری شکست کے بعد مکہ معظمہ چلا گیا تھا۔ کئی سال وہاں گزارے پھر ہندوستان آیا تو نواب جوناگڑھ کے پاس ملازم ہو گیا۔ ۱۸۷۲ء میں یہ بمبئی گیا ہوا تھا، وہاں پہچان لیا گیا۔ گرفتار ہوا اور مقدمہ چلا جس میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ نے سزائے موت کو حبس دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا۔ انڈیمان ہی کی آغوش میں آسودہ ہے۔

سید محمد اسحاق اصل وطن ٹونک تھا، اسحاق کے والد اور تایا وہاں ملازم تھے اور نواب انھیں بڑے احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسحاق کے بچپن ہی میں والد فوت ہو چکے تھے، والدہ نے تربیت کی۔ دہلی میں بھی تعلیم پائی۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچ کر مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پھر ٹونک چلا گیا۔ سرحد پر گرفتاری عمل میں آئی۔ نواب نے خود مداخلت کر کے رہا کرایا۔ بعد ازاں کابل چلا گیا کہ ہندوستان سکونت کے قابل نہ رہا تھا۔

سید گلزار علی ان کا اصل وطن امروہہ اور والد کا نام سید اکبر علی تھا، (بن سید قرب علی بن سید عبدالواحد بن سید عبدالباری بن دیوان سید محمود) طبیعت کے بڑے فیاض تھے۔ ساری جائداد ختم کر کے مختاری کا امتحان پاس کیا اور مرادآباد کی عدالتوں میں مختاری کا کام کرتے رہے۔ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مرادآباد کا جیل خانہ ٹوٹا تو سید گلزار علی امروہہ پہنچے اور وہاں قومی تنظیمات شروع کر دیں۔ ایک عرضداشت بھی بہادر شاہ کے پاس بھیجی جس کا مفاد یہ تھا کہ شیخ بشارت علی خاں کو یہاں انتظام کے لیے چھوڑ کر خود چالیس آدمیوں کے ساتھ خدمت گزاری کے لیے دہلی پہنچ رہا ہوں۔

سید گلزار علی کے مکانات منہدم کرا دیے گئے۔ یہ روپوش رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

میرزا بیدار بخت مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ کے پوتے تھے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں کے مشورے کے مطابق ایک اخبار دہلی سے نکالا تھا جس کا نام "پیام آزادی" تھا اور اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑی خدمات انجام دیں۔ انگریزی تسلط کے بعد یہ گرفتار ہوئے اور ان کے جسم پر سؤر کی چربی مل کر پھانسی دی گئی۔[1]

سعادت خاں بیان کیا جاتا ہے کہ سعادت خاں اندور کے اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جسے ریاست بخشی گری کا منصب مدت تک حاصل رہا اور اس کا والد رسالدار تھا۔ نیز اسے جنگی کے محکمے میں بھی عہدہ

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۳۷

حاصل تھا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ سعادت خاں کو اندور میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے کوئی حیثیت حاصل نہ تھی اور بیکار پھر رہا تھا۔

یکم جولائی کو اندور میں انگریزی ریزیڈنسی پر یورش ہوئی تو مجاہدین میں پیش پیش یہی سعادت خاں تھا۔ یہ اس یورش میں زخمی بھی ہوا لیکن انگریز ریزیڈنسی کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجا اندور نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ بعد ازاں یہ اپنے خاندان کے ساتھ ریزیڈنسی میں رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔

مولانا فیض احمد عثمانی

جنگ آزادی کے نامور مجاہدوں میں سے ایک مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی بھی تھے۔ شجرہ نسب یہ ہے: فیض احمد بن حافظ غلام احمد، بن مولانا شمس الدین، بن مولانا محمد علی بدایونی۔

۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا فضل رسول بدایونی، ان کے ماموں تھے۔ انھیں سے تعلیم حاصل کی اور چودہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہوئے۔ خود مولانا فضل رسول نے سند دیتے وقت لکھا کہ وہ جامع کمالات انسانی ہیں۔ کچھ دیر درس دیا، پھر ملازمت کر لی۔ آخر میں بورڈ آف ریونیو کے سررشتہ دار ہو گئے تھے۔ آگرہ میں ولیم میور نے بھی آپ سے عربی پڑھی تھی۔ مولانا احمد اللہ شاہ آگرہ پہنچے تو ان سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا۔ پادری فنڈر سے مناظرے میں بھی مولانا فیض احمد شریک رہے۔ ۱۸۵۷ء میں احمد اللہ شاہ کی معیت اختیار کر لی تھی۔ محمدی پہنچنے تک ساتھ تھے۔ جب مولانا احمد اللہ شہید ہو گئے تو مولانا فیض احمد کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا کہاں گئے۔ ان کی تصانیف بھی ہیں۔ شعر بھی کہتے تھے۔[2]

حکیم محمد عبدالحق

حکیم محمد عبدالحق بن محمد حسن بخش، اصل وطن دہلی تھا۔ مدت تک راجا ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ کے ایجنٹ رہے۔[1] خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ بلبھ گڑھ میں دیوانی پر مامور تھے، خوب روپیہ پیدا کیا اور بہت مالدار ہو گئے۔ پھر ملازمت سے مستعفی ہو کر گھر آ گئے۔ چونکہ احمد میرزا اور جے سکھ راؤ کے لڑکوں کی وجہ سے نواب حامد علی خاں کے ہاں آنا جانا تھا، اس لیے پھانسی دی گئی۔

۱؎ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، ص ۱۳۰۔ ۲؎ تذکرہ علمائے ہند و رسالہ العلم کراچی بابت اکتوبر و دسمبر ۱۹۵۶ء۔

میوٹنی ریکارڈس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب بہادر شاہ کے اےڈی کانگ بن گئے تھے۔ ان کے ماتحت چار سو سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا، جو انگریزی فوج سے لڑا۔ ان میں سے دس بارہ مقتول و مجروح ہوئے۔ اس فوج میں حکیم صاحب کا ایک عزیز اکبر علی جمعدار تھا۔ وہ بھی زخمی ہوا تھا اور زخموں ہی کی وجہ سے وفات پائی۔[1]

حکیم صاحب باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، جو جنگ کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ ضلع گوڑگانوہ کا انتظام ان کے سپرد تھا۔[2]

بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا بلبھ گڑھ نے ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء کو ایک عرضی دی تھی جس میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپے کا الزام لگایا گیا تھا۔[3] ایک مقام پر ذکر ہے کہ حکیم صاحب دربار میں آئے اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے۔[4]

ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔[5]

نواب محمد حسن خاں یہ ارتضیٰ خاں کے فرزند تھے اور انھیں دو سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں مرزا خضر سلطان کے مختار اور معتمد علیہ ایجنٹ بن گئے تھے۔ میرزا مغل بھی ان سے کام لیتے رہے۔ ہنڈن ندی اور رو بادلی کی سرائے کی لڑائیوں میں یہ مجاہدین آزادی کے ایک جیش کی کمان کر رہے تھے۔ جھجر کے علاقے سے حکیم عبدالحق اور احمد قلی خاں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ انھیں بھی حکیم صاحب کے ساتھ ہی پھانسی کی سزا دی گئی۔[6]

خواجہ حسن نظامی نے ان کا نام محمد حسین خاں لکھا ہے، نیز فرمایا ہے کہ صحت خراب تھی اور قرضدار ہو گئے تھے۔ کثیر الاولاد تھے ان کے بعد متعلقین بہت پریشان حال رہے۔[7]

عبدالصمد خاں نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کے خسر تھے۔ اڑھائی سو سوار ان کے ماتحت تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے تو ہمت و مردانگی سے جنگی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں میرزا مغل کی ایک عرضی سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالصمد خاں سے جنگی مشورے لیے جاتے تھے۔

۱۔ میوٹنی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۳۶۲ ۲۔ جلد ہفتم حصہ دوم صفحہ ۳۶۲۔ ۳۔ بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) صفحہ ۵۶۔
۴۔ ایضاً صفحہ ۱۶۷۔ ۵۔ میوٹنی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اول صفحہ ۳۶۲۔ ۶۔ ایضاً ایضاً۔ ۷۔ غدر کا نتیجہ صفحہ ۵۸

جب دہلی میں ناکامی ہوئی تو یہ باہر نکل گئے۔ دیر تک اپنے سواروں کو جا بجا لڑاتے رہے۔ پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ یہ یقینی ہے کہ نہ کسی جنگ میں مارے گئے اور نہ گرفتار ہوئے۔

نورالہدیٰ

ان کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ۲۹۔ اگست کے "پنجابی" سے معلوم ہوا کہ یہ پونا چھاؤنی میں رہتے تھے اور ان کے ذریعہ سے دکن میں جہاد کے لیے تنظیم کا کام جاری تھا۔ قاضی بلگام اور حیدرآباد شہر کے بعض اکابر سے مولوی نورالہدیٰ نے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ ان کی خط و کتابت کی نگرانی شروع ہوئی۔ بلگام کے ڈپٹی کمشنر نے چند خط کھولے تو حقیقت حال کا انکشاف ہوا۔ اس نے تار بھیج کر مولوی صاحب کی گرفتاری کی ہدایت کی۔ ایک روز وہ خط لینے کے لیے ڈاک خانہ پہنچے تو انھیں گرفتار کرکے پہلے کوارٹر گارد میں رکھا گیا، پھر تین اور ساتھیوں کے ہمراہ تھانہ جیل میں بھیج دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تین سال پیشتر وہ جہاد ہی کے مواعظ کی بنا پر احمد نگر سے نکالے گئے تھے۔

انگریزوں کو ان کے خلاف سخت غصہ تھا۔ بار بار پوچھتے تھے کہ انھیں فوراً توپ سے کیوں نہ اڑا دیا گیا؟ یہ جولائی کے اواخر کا واقعہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بعد میں مولوی نورالہدیٰ سے کیا سلوک ہوا۔